حضرت نیاز فتحپوری کا معرکۃ الآرا مقالہ

ملک خطا کے شہزادے
قیمت معہ محصول ایک روپیہ

مذہب
شایع ہوگیا

نگارستان کا جدید اڈیشن
قیمت علاوہ محصول تین روپیہ

مذہب کیونکر پیدا ہوا، اس نے کیوں اور کس طرح ترقی کی اس کے زوال کا سبب کیا تھا، اس کا مستقبل کیا ہوسکتا ہے اور اسلام کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ اگر اسکی مفصل داستان آپ کو سننا ہے تو یہ کتاب ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت معہ محصول ۱۴ عہ۔ منیجر نگار

چندہ سالانہ پانچ روپیہ
ششماہی تین روپیہ

نگراں : نیاز فتحپوری

ادارہ : مجلۂ نیازی
شوکت جہاں

جلد ۴۵ | فہرست مضامین جون ۱۹۴۴ء | شمار ۶

ملاحظات ---------- ۲
کیا قتیل کا وطن فرید آباد تھا؟ ---------- مختار الدین احمد آرزو ---------- ۴
اسلوب بیان ---------- شوکت سبزواری ام-اے ---------- ۱۶
اپنی یادیں ---------- رشید احمد صدیقی ام-اے ---------- ۲۲
مالہ وماعلیہ ---------- ۳۶
سانپ (نفسیاتی مطالعہ) ---------- شنکر سروپ بھٹناگر ام-اے ---------- ۳۸
مکتوبات نیاز ---------- ۴۲
باب الاستفسار ---------- ۴۴
گزرجا (نظم) ---------- ماہر القادری ---------- ۴۶
موت (نظم) ---------- علی اختر-اختر (حیدرآباد) ---------- ۴۷
میرا ماحول (نظم) ---------- پروفیسر شور ---------- ۴۸
غزلیں ---------- حسرت ترمذی-قہر اکبرآبادی-نیساں اکبرآبادی ---------- ۴۹
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۰

آیندہ ماہ جولائی کی اشاعت میں ایک بڑا معرکۃ الآرا مقالہ ترکی کے متعلق شایع ہو رہا ہے جس میں خالص ترکی ذرایع سے وہاں کی سیاست و معاشرت و مذہبیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
منیجر

ملاحظات

جنگ اس مہینے کے وسط میں، لڑائی بہت پھیلی رہی اور معرکۂ سباسٹپول کے بعد جس میں روس کو واقعی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی کوئی قابل ذکر رن نہیں پڑا۔ لیکن مئی کے اخیر میں اٹلی کے محاذ پر ضرور بعض خلاف توقع تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ یعنی اتحادیوں نے مہینوں کی کاوش و کوشش کے بعد کاسنو بھی لے لیا اور اس کے بعد دشمن کے اُس خط مدافعت کو بھی توڑ دیا جسے ہٹلر لائن کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اب دشمن روم کی طرف ہٹتا جا رہا ہے اور اتحادی فوجیں اٹلی کی اس تاریخی راجدھانی سے قریب ہوتی جا رہی ہیں

اس میں شک نہیں یہ خبر بڑی امید افزا ہے، لیکن اطمینان بخش نہیں، کیونکہ جب کاسنو پانچ مہینے سے پہلے سر نہ ہو سکا، تو روم کے متعلق (جہاں، دشمن کی بڑی زبردست قوت موجود ہے) یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس پر آسانی سے قبضہ ہو جائے گا۔ گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ سال بھی یونہی گزر گیا

اس میں شک نہیں کہ پبلک اُن ذمہ داریوں کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتی، جو ایک محارب ملک و قوم کے سامنے ہوتی ہیں، اور یہ معمہ شاید جنگ کے بعد ہی حل ہو سکے کہ یورپ میں کیوں ہمیشہ ایک جدید محاذ کا مطالبہ کیا گیا، اور کیوں وہ وقت آئندہ پر موقوف ہوتا رہا۔ تاہم یہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اٹلی کا محاذ بھی دشمن کے خلاف ایک محاذ ہی ہے اور اگر اب خود اس محاذ کے لئے کسی دوسرے محاذ کی ضرورت پیش آگئی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس دوسرے محاذ کے لئے کسی تیسرے محاذ کی اور تیسرے کے لئے چوتھے محاذ کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اتحادی ایک ہی محاذ سے تمام دوسرے محاذوں کا کام لینا چاہتے ہوں اور ان کا مقصود ملک فتح کرنا نہیں بلکہ دشمن کو مغلوب کرنا ہو، جس کے لئے لڑائی میں تھکا دینے والی تدبیر بہت کامیاب ثابت ہوتی ہے

اس وقت ناروے سے لیکر خلیج بسکے تک نازی فوجیں بالکل طیار کھڑی ہیں اور فرانس، ڈنمارک و بلجیم کے تمام ساحلی مقامات کو ہر ممکن طریقہ سے انھوں نے محفوظ کر دیا ہے، اس لئے اگر جنگ کا فیصلہ دشمن کے ان تمام خطوط مدافعت توڑنے ہی پر منحصر ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ابھی سالہا سال تک کسی نتیجہ کی توقع نہیں کی جا سکتی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اتحادیوں کی تدبیر براہ راست دشمن سے ٹکر لینا نہیں، بلکہ اس کے ذرایع مدافعت اور اس کی قوت صبر و تحمل کو ختم کر دینا ہے، جس کے لئے وقت تو بیشک زیادہ درکار ہوگا، لیکن اسی کے ساتھ جانوں کا نقصان بھی کم ہوگا، چنانچہ اتحادیوں کی طرف سے جو ہوائی تاخت دشمن کے مقبوضہ ممالک پر روزانہ ہو رہی ہے ممکن ہے اسکا تعلق بھی اسی تدبیر سے ہو اور ہو سکتا ہے کہ اسی سلسلہ میں کبھی وہ وقت بھی آجائے جس کی توقع کی جاتی ہے

روس، اپنا مفتوحہ دشمن سے واپس لے چکا ہے، اس لئے اس کے اقدام کی رفتار کو سست ہو جانا چاہئے لیکن

ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس وقت تک دم نہ لیگا جب تک نازی حکومت ختم نہ ہو جائے، کیونکہ اس کے لئے بڑا اہم سوال اپنا ملک واپس لینے کا نہیں، بلکہ اس قوت کے ختم کر دینے کا ہے، جس کی طرف سے ہمیشہ خونریزی کا اندیشہ کیا جا سکتا ہے

لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ روس کا اقدام اب کس طرف ہوگا۔ تاہم رومانیا اور بلغاریہ میں جو صورتِ حال اس وقت پیدا ہو گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ روس کی دوسری ضرب اسی جگہ ہوگی

ایشیا میں، برما، آسام، چین اور بحرِ پاسفک کی لڑائیاں کچھ یوں ہی سی رہیں، البتہ نیوگنی میں امریکی اور برطانوی فوجوں کا پہونچ جانا، بیشک بڑی مفید بات ہوئی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح امن و سکون کے زمانہ میں ایشیا پر ہمیشہ یوروپ کو ترجیح دی گئی، اسی طرح جنگ کے زمانہ میں بھی یہ امتیاز باقی ہے یوروپ کی لڑائی لڑی جائے تو پھر ادھر توجہ کی جائے۔ ہم لوگوں کی موت و زندگی دونوں بہت معمولی باتیں ہیں

بعد از جنگ

جنگ سے زیادہ ٹھوس حقیقت اسوقت کوئی اور نہیں، لیکن چونکہ وہ نہایت تلخ حقیقت ہے اس لئے اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی دم اُلجھتا ہے اور اگر نہ کیجئے تو بھی چین نہیں

جنگ اس وقت ایک ایسی پھانس ہے، جس کی کھٹک تو ہر وقت محسوس ہوتی رہتی ہے، لیکن چونکہ اس پھانس کا نکالنا اپنے اختیار میں نہیں، اس لئے اس کا ذکر بھی کوئی معنی نہیں رکھتا

فارسی کا ایک مشہور مصرعہ ہے:

من کردہ ام آغاز بہ پایاں کہ رساند

بالکل یہی حال اس وقت ان قوموں کا ہے جنھوں نے لڑائی تو چھیڑنے کو چھیڑ دی، لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ابتدا کی انتہا کیا ہوگی اور اس عفریت کو ٹالنے کے لئے کونسی قربانی انھیں پیش کرنا چاہئے

یہ بالکل صحیح ہے کہ نقشۂ جنگ اب بدل گیا ہے، اس میں بھی کلام نہیں کہ محوری طاقتوں کی کامیابی کی بظاہر کوئی امید نہیں — لیکن جنگ بہرحال جاری ہے اور دُنیا روز تازہ مصیبتوں میں گرفتار ہوتی جا رہی ہے

ان مصائب کا تعلق اگر زندگی کے کسی ایک پہلو سے ہو، تو خیر، اس کا کوئی علاج سوچا جا سکتا ہے، لیکن جب تمام دُنیا کے انسانی تمدن کا شیرازہ بکھر جائے تو پھر سوائے صبر کے کیا چارہ ہے، اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انسانی آبادی اس وقت جس صبر آزما دور سے گزر رہی ہے، اس کی نظیر تاریخ کے صفحات میں کہیں نظر نہیں آتی

یہ درست ہے کہ تلخی و شیرینی، نشیب و فراز، گرم و سرد کوئی پائیدار چیز نہیں اور یقیناً ایک وقت آئے گا جب دنیا اس بحرانی دور سے گزر کر پھر صحیح و توانا نظر آئے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ صحت و توانائی کس قسم کی ہوگی؟ آیا اسی قسم کی جو اس سے پہلے پائی جاتی تھی اور جو بعض قوموں کے لئے ہزار بیماریوں کی ایک بیماری تھی، یا اس کی نوعیت کچھ اور ہوگی؟

اسی مشکل سوال کا کام "اصلاح بعد از جنگ" ہے، جس پر ہر وہ شخص جو تھوڑی سی بھی ذمہ داری اپنے سر رکھتا ہے سوچ رہا ہے اور رائے زنی میں مصروف ہے۔ لیکن جس طرح اختتام جنگ سے پہلے اصلاحات بعد از جنگ پر غور و فکر نفسیاتی ہمت افزائی سے زیادہ نہیں، اسی طرح اُن اصلاحات کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ دنیا کے آیندہ امن و سکون کی ضامن ہوں گی، محض مقطع کی "سخن گسترانہ بات" معلوم ہوتی ہے۔

کیا قتیلؔ کا وطن فرید آباد تھا؟

بارھویں صدی ہجری کے آخر اور تیرھویں صدی کی ابتدا میں مرزا قتیلؔ کی ذات بھی عجیب و غریب گزری ہے، فارسی زبان کا مشہور مصنف و شاعر، متعدد اُردو[1] شعرا کا اُستاد، لیکن آج تک اس کے نام کے متعلق جھگڑا ہے، اس کی وطنیت مشتبہ ہے، اس کی عمر کا پتہ نہیں، کہاں کہاں رہا نہیں معلوم، کیا کیا کرتا رہا نہیں کہا جا سکتا، کب وفات پائی اس میں اختلاف، کب پیدا ہوا اس کی تحقیق نہیں۔

اٹھارہ سال کی عمر تک اس کا کیا نام رہا یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، ایک تذکرہ نے اس کا نام دلوالی سنگھ Dilwali sing ایک مورخ نے دِوالی سنگھ Diwali singh ایک مضمون نگار نے دیوانی سنگھ Diwani singh ایک مستشرق نے دَوالی سنگھ Dawali Singh اور ایک مشہور اُردو شاعر نے دیوالی سنگھ Diwali Singh بتایا ہے، مسلمان ہونے کے بعد اس کا نام بدلا گیا، نام کیا رکھا گیا، مختلف اصحاب مختلف اسماء بتاتے ہیں۔

ابو طالب نے اس کا نام محمد قتیل، نواب صدیق حسن، حکیم عبدالغنی، صاحب ریاض الفردوس، مصحفی اور مولف معراج الخیال نے محمد حسین، پنڈت کیفی اور ڈاکٹر عبدالحق، محمد احسن، عبرتی اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے محمد حسن لکھا ہے۔

اس کا سال ولادت فرقتی دہلوی عظیم آبادی ۱۱۶۶ھ، عبرتی ۱۱۷۰ھ اور حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی ۱۱۷۲ھ بتاتے ہیں۔ صاحب نتائج الافکار صرف یہ کہکر ٹال دیتے ہیں کہ اس کی وفات تیرھویں صدی کے عشرۂ چہارم میں ہوئی، صاحب شمع انجمن ۱۲۴۰ھ بتاتے ہیں، عبرتی عظیم آبادی ۱۲۳۰ھ، انگریز قاموس نگار ٹیلر ۱۲۳۲ھ، گلشن مشتاق، قاموس المشاہیر اور تاریخ اودھ میں ۱۲۳۳ھ درج ہے۔

---

[1] تقریباً تمام تذکرے جو ہماری نظر سے گزرے ہیں اس کی اُردو شاعری کے بارے میں خاموش ہیں، ہم نے اسکے دو دواوین و کلیات کے متعدد قلمی نسخے دیکھے لیکن کسی میں اس کا اُردو کا ایک شعر بھی نہیں ملا، صرف سعادت خاں ناصر کا نایاب تذکرہ "خوش معرکۂ سخن" میں اس کا ایک اُردو شعر درج ہے، اس کی اصل عبارت یہ ہے: "چونکہ مولد اس کا ہندوستان تھا بحکم کل شئی یرجع الی اصلہ کبھی کوئی مصرع یا بیت زبان ریختہ میں بھی کہتا چنانچہ یہ شعر ہے

زنگی بچے کا حسن عدیم المثال ہے ثانی جو اس کا ہے تو کوئی خال خال ہے

اگرچہ یہ شعر اس کا دو ہی مرتبہ ہے مگر ریختہ گویوں ہی کا تذکرہ ہے اور اکثر ہندی گو اس کے شاگرد ہیں لکھا گیا" (ص۵۵ نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور)

ابھی حال میں دریائے لطافت حصۂ عروض میں ایک شعر پر نظر پڑی تعجب نہیں کہ یہ شعر اسی کا ہو:

جہاں میں بنس مروت کا جا بہ جا ہے قحط میں جانتا ہوں کہ دشمن مرا ہے یار مرا

میر وزیر علی اس کی عمر ساٹھ سال، حسین قلی خاں اکسٹھ سال اور سید میر جان دہلوی (بہ حوالۂ امید امیٹھوی؟) سر سٹھ سال بتاتے ہیں۔

عبرتی کا بیان ہے اسلام لاتے وقت اس کی عمر سترہ سال تھی، غلام ہمدانی اور قدرت اللہ اٹھارہ سال بتاتے ہیں، عاشقی کا بیان ہے کہ چودہ سال ہی کی عمر میں اس کے دل میں اسلام کی محبت موجیں مار رہی تھی، تذکرہ سفینۂ ہندی میں ہے کہ وہ صغر سن میں مسلمان ہوا، گلشن مشتاق میں درج ہے کہ عنفوانِ شباب میں اسلام لایا۔

سفینۂ ہندی اور نتائج الافکار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہونے کے بعد وارد شاہجہاں آباد ہوا اور وہیں عربی و فارسی کی تحصیل کی، لیکن مصحفی لکھتا ہے کہ اس کی تعلیم شاہجہان آباد میں نہیں بلکہ فیض آباد میں ہوئی۔

قتیل کی وطنیت میں بھی کافی اختلاف رہا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے، متقدمین اور متاخرین دونوں کے اقوال اس معاملے میں مختلف رہے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری کے مورخین اور تذکرہ نگاروں سے لے کر ہمارے زمانے کے محققین اور مضمون نگار تک اس میں مختلف الاقوال نظر آتے ہیں کہ اس کا وطن کہاں ہے۔

مصحفی نے اس کے بزرگوں کا وطن ٹالی، بھگوان داس نے بٹالہ، عبرتی نے پٹالہ، صاحب ید بیضا (؟) نے بٹالہ، نواب صدیق حسن نے لاہور، محمد حسین نے لکھنؤ، مرزا غالب نے دہلی بتایا ہے، ناصر نے مولد اس کا ہندوستان تھا، کہنے پر قناعت کی ہے اور یوں وہ اس جھگڑے سے صاف نکل گیا ہے۔

محمد حسین نے اس کا وطن لکھنؤ اس لحاظ سے بتایا ہوگا کہ اس کی نصف زندگی سے زاید لکھنؤ میں تمام ہوئی، وہیں اس نے وفات پائی اور وہیں کی خاک میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ جن تذکرہ نگاروں نے اس کا وطن لاہور بتایا وہ شاید اس طرح کہ پٹیالہ مضافاتِ لاہور میں ہے، پٹیالہ اور پٹالہ اس لئے اس کا وطن کہا جاتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد بٹالہ کے رہنے والے تھے اور کاتبوں کی غلط نویسی کی وجہ سے اس نام کی مختلف شکلیں پیدا ہو گئی تھیں، ابو طالب اور عبرتی نے اگر اس کا وطن دہلی بتایا تو مقام تعجب نہیں جبکہ وہ خود: "مولدِ من خاک دہلی اے قتیل" کہتا ہے —— لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قتیل کا فرید آبادی ہونا کس طور پر کہا جاتا ہے۔

قتیل کو فرید آبادی سمجھنے والوں میں سب سے زیادہ پیش پیش سید اسد علی صاحب انوری ہیں جو خود بھی فرید آباد کے رہنے والے ہیں، انھوں نے اپنے مقالہ "قتیل کا وطن"[1] میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا وطن فرید آباد تھا۔ انھوں نے قدیم تذکروں کے کچھ متعدد اقتباسات بھی درج کئے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کسی میں اس کے فرید آبادی ہونے کا ذکر نہیں، صاحب ریاض الفردوس اسے لکھنوی، مرتبین نتائج الافکار اور شمع انجمن لاہوری، مولفِ خلاصۃ الافکار دہلوی اور مصنف عقد ثریا اسے بٹالوی لکھتا ہے مولفین مخزن الغرائب، گلشن مشتاق، خوش معرکہ زیبا، اس کی وطنیت کے بارے میں قطعاً خاموش ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے فرید آبادی ہونے کا ثبوت قدیم تذکروں میں نہیں ملتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ سب سے پہلے کس نے اسے فرید آبادی لکھا، جہاں تک ہم تحقیق کر سکے ہیں اس کی ابتدا کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے، کسی نے اسے فرید آبادی نہیں لکھا۔ ہمیں یہ علم ہے کہ حالی اور نجم الغنی نے بھی اسے فرید آبادی لکھا ہے، لیکن یہ بھی

[1] مطبوعۂ نگار

غور کیجئے کہ ان دونوں کا ادلین ماخذ کیا غالب کی تحریر کے سوا کچھ اور ہے؟ - ہمارے علم میں ان دونوں صاحبوں کا بیان کلیتہً غالب سے ماخوذ ہے
اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حضرات کا پایہ کیا ہے اور ان کی تحقیقات کے باور کرنے کے لایق بھی ہیں یا نہیں -

غالب نے اپنے خطوط میں اسے متعدد جگہ فرید آباد کا بتلایا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مرزا نہ تاریخی تحقیق کا آدمی تھا اور نہ اُسکا دماغ اس کام کے لئے موزوں تھا، اُسے اپنے دادا تک کا حال تو معلوم نہیں - وہ کہتا ہے میرا دادا شاہِ عالم کے زمانہ میں ہندوستان آیا حالانکہ شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین نہ معلوم ہونے کی وجہ سے وہ اس غلطی میں مبتلا ہو گیا) یہ بھی نہیں کہ اُسے قتیل سے کوئی خاص تعلق رہا ہو کہ حالات جاننے کی کوشش کی ہو اُسے قتیل کا نام تک صحیح نہیں معلوم -

حالی اور نجم الغنی ظاہر ہے اس معاملے میں غالب کے مقلد محض ہیں انھوں نے قتیل کی وطنیت کے سلسلہ میں کوئی خاص تحقیق کی ہو اس کی قطعاً توقع نہیں - فرقتی کا تذکرہ موجود نہیں اور ہمیں اس کے وجود میں کافی شبہ ہے[1]، لیکن اگر اس کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے تو جو شخص ایک چھوٹے سے جملے میں دو غلطیاں کر سکتا ہے اس کی تیسری بات کا کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے نہ یہ صحیح ہے کہ وہ ۱۱۶۶ء میں پیدا ہوا اور نہ یہ درست ہے کہ وفات کے وقت اس کی عمر ۶۷ سال کی تھی، پھر ان تمام لوگوں کے بیانات غالب ہی سے ماخوذ ہیں - یہ صحیح ہے کہ غالب دہلی ہی میں تھا جب قتیل کا طوطی لکھنؤ میں بول رہا تھا لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ وہ یہ جملے کب اور کہاں لکھ رہا ہے یہ جملے اس کے قلم سے ۱۲۴۳ھ میں نکلے جب قتیل کی وفات پر تقریباً ایک جگ گزر چکا ہے اور لکھ رہا ہے دہلی سے ایک ہزار میل دور بیٹھ کر کلکتہ میں -

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ قتیل کی وطنیت فرید آباد کی قدیم ترین شہادت مرزا غالب کے وہ رقعات ہیں جن میں قتیل کا کئی جگہ ذکر آیا ہے ایک تو یہ کہ مرزا غالب کو تاریخ و جغرافیہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی" اور وہ ان لوگوں میں تھا جن کو ماضی کی بہ نسبت حال سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، دوسری بات یہ کہ وہاں مقصود تاریخی طور پر کسی کا ذکر کرنا نہیں بلکہ فرہنگ نویسوں پر غیظ و غضب کا اظہار تھا، تیسری بات یہ کہ ایک غیر مطبوعہ مکتوب میں جو اُردوئے معلیٰ یا عود ہندی میں شامل نہیں ہے وہ اسے لکھنوی بتاتا ہے، غالب مولوی ضیاء الدین خاں کو ایک طویل اُردو خط میں لکھتا ہے :

"۱۸۰۰ء یا ۱۸۰۱ء میں ہوس ناک لوگ فارسی کی فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے - نہ ایک نہ دو بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہو گئیں -
یہاں تک کہ قتیل تو مسلم لکھنوی اور ملا غیاث الدین ملائے کتب دار امپور اور کہاں تک کہوں کون کون، جسکے جی میں آئی وہ متصدی تحریر قواعد انشا ہو گیا"

---

[1] انوری صاحب نے اپنے مضمون میں فرقتی کے تذکرہ شمع انجمن کا بھی حوالہ دیا ہے ہم سید میر جان فرقتی دہلوی سے ناواقف نہیں ہیں، اس کا نام سید علی بخش تھا۔ دہلی میں پیدا ہوا، آبا و اجداد ملتان کے رہنے والے تھے، سلسلۂ جدی سید بہاء الدین ذکریا ملتانی تک پہونچتا ہے، ۱۲ سال کی عمر میں باپ کے ساتھ وارد عظیم آباد ہوا اور میر محمد مہدی عیشی سے درس کا سلسلہ شروع کیا، عبرتی کی شاگردی کا فخر بھی اُسے حاصل ہے، ۱۲۰۳ھ تک ضرور زندہ تھا اس کے بعد بھی زندہ رہا ہو تو تعجب نہیں اس کا حال بھی بعض تذکروں میں ملتا ہے لیکن اس بات کا کہیں سراغ نہیں ملتا کہ اس نے کوئی تذکرہ بھی مرتب کیا تھا، امید امیٹھوی صاحب کو یہ بتانا تھا کہ انھوں نے یہ تذکرہ کہاں دیکھا - یہاں پر میں یہ بات صاف کر دوں تو بہتر ہے کہ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ فرقتی نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا گو یہ ضرور ہے کہ امید امیٹھوی کے حافظہ پر جو اعتماد فرید آبادی صاحب کو ہے اس میں دوسرا شریک نہ ہو تو الزام نہیں دیا جا سکتا، مزید یہ کہ فرقتی بہت بعد کے آدمی ہیں، انکا بیان چنداں قابل اعتنا نہیں، خصوصاً اس صورت میں جب کہ معاصرین قتیل کچھ اور کہتے ہیں

اس عبارت سے میرے اس خیال کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ مرزا نے قتیل کے وطن کے بارے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کی، جب جی میں آیا فرید آباد کا لکھ دیا جب دل چاہا لکھنوی بنا دیا، یہ مکتوب ۱۸۶۲ء کے بعد کا لکھا ہوا ہے اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے وہ واقعی قتیل کو فرید آبادی سمجھتا ہو پھر بعد کو جب اس کا بطلان ثابت ہو گیا ہو تو اس لحاظ سے کہ اس کی زیادہ تر زندگی لکھنؤ ہی میں گزری (بروایت عاشقی) اسے لکھنوی لکھ دینا زیادہ مناسب سمجھا ہو۔ فرقتی دہلوی ضرور ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ بارہ سال ہی کی عمر میں دلی چھوڑ کر عظیم آباد آ چکا تھا۔ پنڈت برج موہن کیفی دہلوی اور غلام رسول مہر نے بھی اسی فرید آبادی لکھا ہے لیکن ان دونوں صاحبوں کے پاس مرزا غالب کی تحریر کے سوا ظاہر ہے اور کوئی ثبوت نہیں۔

فرید آباد قتیل کا وطن کس طرح ہے؟ وہ وہاں پیدا نہیں ہوا، اور نہ وہاں وفات پائی، نہ وہاں قیام کیا اور نہ وہاں سکونت اختیار کی، فرید آباد میں نہ اس کا تو وطن ثابت ہے اور نہ اس کے آبا و اجداد کا۔

اس کا باپ ڈاسنہ میں رہا یا شاہجہاں آباد میں، وہ خود ۱۱۷۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوا۔ ۱۸ سال کی عمر تک یعنی تقریباً سنہ ۱۱۹۰ھ تک تحصیل علم کرتا رہا، یا تو دہلی رہا یا فیض آباد سنہ ۱۱۹۰ھ میں فیض آباد میں شہید[1] کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اب تک وہ دیوانی سنگھ تھا اب وہ محمد حسن ہو گیا، مسلمان ہونے کے بعد گھر بار چھوڑ کر الگ ہو گیا اور ایک زمانہ تک اطراف شاہجہاں آباد میں نجف خاں کے لشکریوں[2] کے ساتھ گھومتا رہا۔ یہ ظاہر ہے کہ سنہ ۱۱۸۹ھ یا سنہ ۱۱۹۰ھ تک یعنی اسلام لانے سے پہلے تک وہ کافی سیاحت کر چکا ہو گا، مصحفی عقد ثریا کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں قتیل کا تعلق لشکر نواب نجف خاں سے تھا وہ دہلی آتا اور مصحفی کے مشاعروں میں شریک ہوتا، یہ مشاعرے ہمارے خیال کے مطابق سنہ ۱۱۸۶ھ سے سنہ ۱۱۹۸ھ تک کی مدت میں ہوتے رہے، تذکرہ عقد ثریا کی ترتیب کا خیال خود قتیل ہی نے اسے دلایا تھا: "چوں مرزائے مزبور خیلے سیاحت کردہ و در مجلس وضع و شریف رسیدہ نظم و نثر از اشعار و احوال معاصرین جستہ جستہ بر بیاض خاطر خود منقوش داشت، روزے ۔۔۔ فسوں تالیف تذکرہ معاصرین بگوشم دمید" (ص ۲)

یہ سطریں جب لکھی جا رہی تھیں اس وقت تک نجف خاں فوت نہ ہوا تھا اس کا سال وفات ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۱۹۶ھ ہے، ظاہر ہے کہ سنہ ۱۱۹۵ھ یا سنہ ۱۱۹۶ھ سے پہلے ہی وہ کافی سیاحت کر چکا تھا اور متعدد مجلس وضع و شریف دیکھ چکا تھا، قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس کی سیاحت قبل از اسلام یعنی سنہ ۱۱۹۰ھ کی ہے اس لئے کہ اسلام لانے کے بعد اس کا تعلق نجف خاں کے لشکریوں سے ہوا اور وہ ان کے ساتھ دہلی و اطراف دہلی کا گشت کرتا رہا، اتنا ظاہر ہے کہ یہ تعلق سنہ ۱۱۹۶ھ میں ختم ہو گیا۔ اب عاشقی کا بیان پیش نظر رکھئے وہ لکھتا ہے: "تا مدت در اطراف شاہجہاں آباد بہ لشکر نجف خاں می گشت" "تا مدت" کا لحاظ کرتے ہوئے ماننا پڑے گا کہ کم از کم سنہ ۱۱۹۰ھ سے اس کا تعلق ضرور پیدا ہو گیا تھا۔

اس لحاظ سے قتیل کی سیر و سیاحت کا زمانہ یقیناً اس سے پہلے ماننا پڑے گا، دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سنہ ۱۱۷۲ھ[3] سے سنہ ۱۱۹۰ھ تک وہ دہلی، فیض آباد وغیرہ گھومتا رہا۔ سنہ ۱۱۹۶ھ تک وہ نجف خاں کے لشکر کے ساتھ پھرتا پھراتا رہا سنہ ۱۱۹۶ھ سے

---

[1] مصحفی کا بیان ہے: "در ایامے کہ متعلقاتش بہ حسب آب خورہ فیض آباد رفتہ استقامت گرفتہ بر دست شہید ہیزدہ سالہ بود کہ مشرف اسلام شد" (عقد ثریا)

[2] اہل بیت خود را خیر باد گفتہ کنارا جست و آزادانہ قدم بہ راہ تجرید نہادہ تا مدت در اطراف شاہجہاں آباد بہ لشکر ذوالفقار الدولہ مرحوم می گشت (نشتر عشق ص ۱۰)

[3] سنہ ۱۱۷۲ھ اس لئے کہ سنہ ۱۱۷۲ھ اس کا سال ولادت ہے اس سال طفلی کے اس سے نکال دینا چاہئے۔

۱۲۲۳ھ یعنی اپنی موت تک وہ لکھنؤ میں رہا وہیں وفات پائی اور وہیں کی خاک میں ہمیشہ کے لئے آسودہ ہوگیا۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ و تذکرہ کا کوئی بیان ہمیں ایسا نہیں ملتا ہے جس سے قتیل کی وطنیت فرید آباد متحقق کیا معنی اُس پر ہلکی سی بھی روشنی پڑ سکے، وطنیت تو بہت بعد کی چیز ہے۔ قدماء کی تحریروں میں قتیل کے قیام فرید آباد تک کا تیقن طور پر پتہ نہیں چلتا ایسی صورت میں جب کہ فرید آباد میں قتیل کا قیام تک متحقق نہیں اسے فرید آبادی کہنا اور فرید آباد اس کا وطن بتانا ہم نہیں سمجھتے کہاں تک قرین انصاف و تحقیق ہے،

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کی ولادت دہلی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی نتائج افکار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کی تکمیل بھی اس نے دہلی ہی میں کی، بعد از اسلام وہ فیض آباد، دہلی، اور اطراف دہلی کی سیر کرتا رہا اور آخر کار لکھنؤ میں جا بسا اور وہیں کی خاک میں ہمیشہ کے لئے سو گیا، اس کے مکاتیب کے مطالعہ سے کچھ اور مقامات[1] کی سیر کا پتہ چلتا ہے لیکن فرید آباد کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

جناب مالک رام صاحب لکھتے ہیں: "قتیل[2] کا اصل وطن کہیں پنجاب ہی میں ہے اول اس لئے کہ بھنڈاری خاندان پنجاب کی پیداوار ہے، دوسرے قتیل کے والد کا نام درگاہی مل، یہ نام ٹھیٹھ پنجابی ہے، نگار مصحفی نمبر میں 'ید بیضا' کے حوالہ سے قتیل کا وطن بٹالہ لکھا تھا، ید بیضا، کا وجود خارج میں ہے یا نہیں اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے[3]، لیکن جونہی یہ پرچہ مجھے موصول ہوا میں نے بٹالہ میں ایک دوست کو خط لکھا کہ مطلع کریں کہ وہاں بھنڈاریوں کے خاندان میں کوئی قتیل کو جانتا ہے اور مجھے کامیابی ہوئی۔

بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کا مشہور قصبہ ہے یہاں کا بھنڈاری خاندان بہت قدیم اور علم دوست خاندان ہے قتیل اسی خاندان سے تھا، ذیل میں اس کے شجرۂ نسب کا ضروری حصہ درج کیا جاتا ہے:

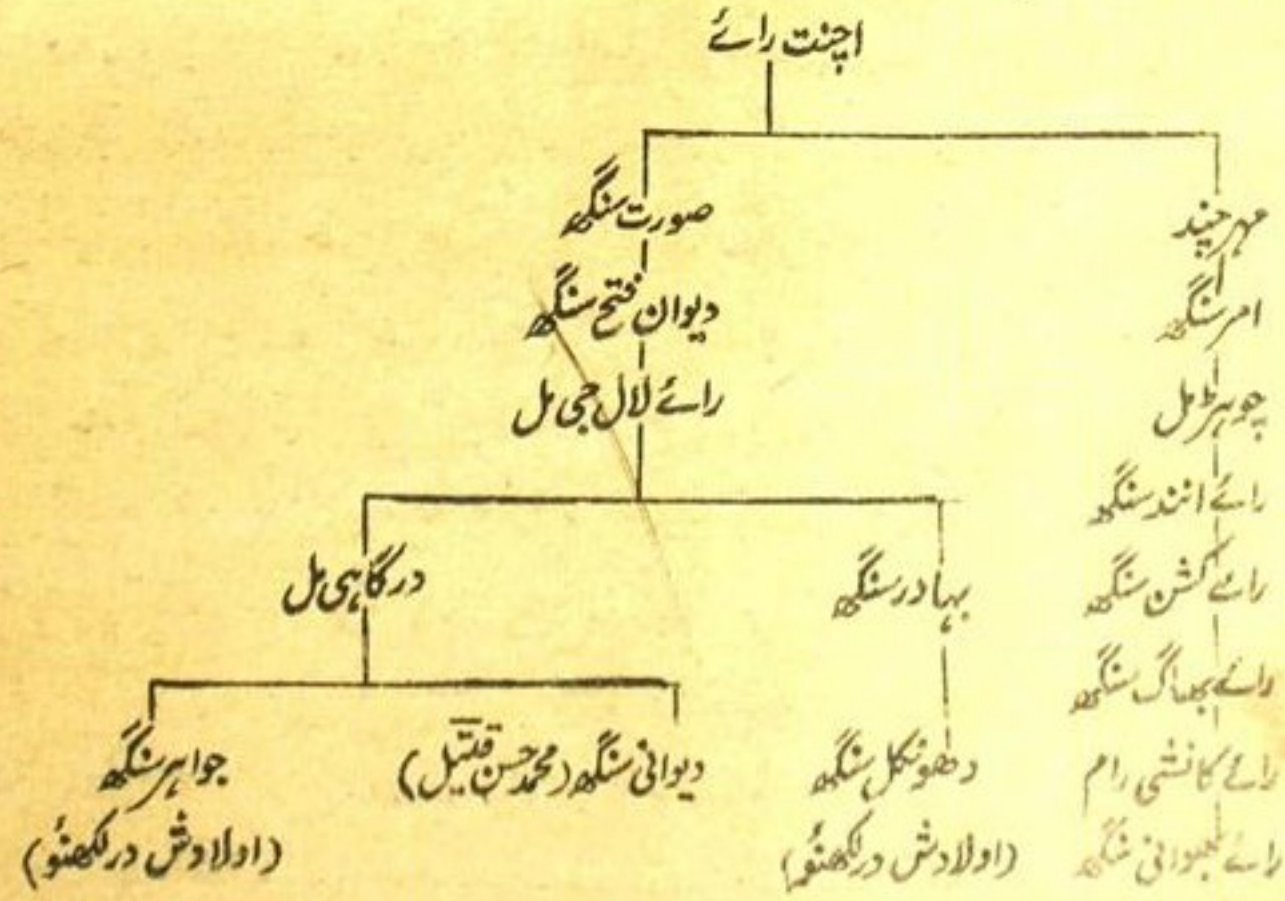

---

[1] مرزا قتیل کے رقعات و مکاتیب کے متعدد مجموعے ہیں، صرف "رقعات مرزا قتیل" میں اس کے مختلف سفروں کا ذکر ملتا ہے، رقعہ (۵۹) سے سفر الہ آباد، سلطانپور پرتاب گڑھ کا پتہ چلتا ہے رقعہ (۱۰۱) سے سفر کان پور کا ارادہ معلوم ہوتا ہے رقعہ (۸۲) سے قیام سلطان پور پر روشنی پڑتی ہے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ نمبر ۹ پر ملاحظہ ہو)

مالک رام صاحب قتیل کو پنجابی سمجھتے ہیں، وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ 'یدبیضا' کا وجود خارج میں نہیں اور وہ ایک جعلی کتاب ہے اس کے ایک بیان سے قتیل کے وطن کا کھوج لگانا چاہتے ہیں، انھیں قتیل کے خاندان کے ایک فرد سے ایک شجرہ ملتا ہے جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا خاندان بٹالہ کا رہنے والا تھا اور قتیل کی پیدائش بھی بٹالہ ہی میں ہوئی۔

افسوس ہے کہ انھوں نے پورا شجرہ نقل نہیں کیا ورنہ ممکن ہے کچھ اور باتیں بھی معلوم ہوتیں سردست تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکے بیان کا پہلا حصہ بالکل صحیح اور درست لیکن دوسرا حصہ یعنی قتیل کی پیدائش بٹالہ میں ہوئی، ہم نہیں تسلیم کرتے۔

اُس کے بزرگوں کی وطنیت کے بارے میں ہم مصحفی کا بیان کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے قتیل سے جو تعلقات مصحفی کے تھے وہ اہل نظر پر پوشیدہ نہیں، تذکرہ 'عقد ثریا'، قتیل ہی کی ترغیب سے اس نے لکھنا شروع کیا تھا بلکہ بہت سا مواد بھی قتیل ہی کا جمع کردہ ہے۔

مصحفی نے خود قتیل کا مولد ہمیں نہیں بتلایا اور نہ اُس کے بیان سے اس کے وطن پر روشنی پڑتی ہے، لیکن "در اصل بزرگانش قوم کھتری بھنڈاری پٹالی بودہ اند" سے اس کے بزرگوں کی وطنیت بٹالہ ثابت ہوتی ہے۔

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قتیل کے آبا و اجداد کی وطنیت بٹالہ کی دلیلیں اب ہمارے پاس ختم ہوگئیں۔ ابھی ہمارے پاس ایک معتبر معاصر تذکرہ نگار جس سے خود قتیل سے تعلقات تھے اور جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے اس سے خط و کتابت بھی جاری تھی اور بھی موجود ہے۔ ہماری مراد آغا حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی سے ہے جس نے فارسی شعرا کے حالات میں اکیس سو صفحات کا ایک ضخیم تذکرہ لکھا ہے، اس میں قتیل کا تذکرہ چھ صفحات میں آیا ہے، یہاں پر صرف قتیل کے آبا و اجداد کی وطنیت کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے اس کے خلاصہ کا ترجمہ کیا جاتا ہے:

"قتیل کے آبا و اجداد ایک چھوٹے سے قصبہ بٹالہ کے رہنے والے تھے (پٹیالہ کے نہیں جو لاہور کے قریب واقع ہے) کچھ زمانے کے بعد جد سوم (غالباً صورت سنگھ) ایک شخص کے ساتھ جو کتھری تھا اور جس سے موانست و برادری تھی بٹالہ سے ہجرت کر کے باغپت چلا آیا۔ قتیل کے باپ اور دادا درگاہی مل اور رائے لال جی مل کی ولادت یہیں باغپت میں ہوئی ۱۱۳۵ھ میں رائے لال جی مر گیا اسکے بعد درگاہی مل باغپت کو چھوڑ کر ڈاسنہ میں جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور دہلی سے ۱۰ کوس پر واقع ہے، بود و باش اختیار کی، ۳ سال تک وہاں قیام کیا تھا کہ (۱۱۴۰ھ میں) نواب ہدایت علی خاں نے بمد نظر استحقاق، روابط و تعلقات جو سید فیض اللہ اور رائے لال جی مل

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ نمبر ۸) اور رقعہ (۱۳۴) سے ہمیں اس کے دو بار سفر بہرائچ کا علم ہوتا ہے۔ ۲ مطبوعہ رسالہ نگار ۔۔۔ ۳ نگار مصحفی نمبر میں ایک مضمون شایع ہوا تھا "مصحفی کی دو بیاضیں" جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ 'یدبیضا' مصحفی کی تالیف ہے اور ثبوت میں کچھ شعرا کے تذکرے بھی پیش کر دیے تھے منجملہ ان کے قتیل کا تذکرہ بھی تھا جس میں اسے بٹالہ کا بتایا تھا، پورا مضمون جعل و تحریف سے بھرا ہوا تھا، تعجب ہے ہندوستان کے نقاد اور محققین پر کہ انھوں نے بے چون و چرا یہ تمام بیانات مان لے اور رسالوں میں اچھے اچھے ریویو شایع ہوئے، ہم نے فوراً ہی ایک طویل مکتوب حضرت نیاز فتحپوری کو لکھا جس اس نمبر پر ایک طایرانہ نظر ڈالی گئی تھی اور مضمون نگار کی تحریف و جعل کا پردہ چاک کیا گیا تھا بعد کو مدیر نگار نے میری اجازت لے کر وہ خط نگار میں "مصحفی نمبر کی بعض غلطیاں" کے عنوان سے شایع کر دیا تھا، جن حضرات کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہو وہ نگار اپریل ۱۹۴۰ء کا مطالعہ فرمائیں۔

میں تھے قتیل کے باپ درگاہی مل کو اپنے پاس بلا لیا، بہت دلجوئی کی اور ہزار روپیہ ذات کا مقرر کر کے اجازت دی کہ اپنے گھر اہل و عیال کے ساتھ رہیں، درگاہی مل مدت العمر کبھی دلاسہ رہا اور کبھی نواب ہدایت علی خاں کے یہاں، انھیں دنوں ۱۱۷۲ھ میں شاہجہاں آباد میں قتیل کی ولادت ہوئی"۔

مرزا قتیل کی ولادت شاہجہاں آباد میں ہوئی اور وہ دہلوی ہے، اس کی وطنیت کے بارے میں یہ رائے قایم کرنے سے پہلے معاصر تذکرہ نگار اور مورخین کے بیانات کے ساتھ ساتھ متاخرین کے اقوال بھی ہم نے پیش نظر رکھے ہیں، ہم نے اپنا مطالعہ یہیں ختم نہیں کر دیا ہے بلکہ خود قتیل کی تمام تحریرات نثر و نظم پر بھی ایک نگاہ ڈال لی ہے اور اس کے دواوین و رقعات کے مختلف مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخے بھی پیش نظر رکھے ہیں، بعض تذکروں سے جو یوروپ میں ہیں افسوس کہ جنگ کی وجہ سے ان سے فی الحال استفادہ ممکن نہیں۔

(۱) "مرزا قتیل والدش از قوم کھتری متوطن پیالہ مضافات لاہور، از قرابتیان (رائے لال جی[1]) بودہ ... خودش در شاہ جہاں آباد رونمودہ در صغر سن شرف اسلام پذیرفتہ ..." (سفینۂ ہندی مرتبہ بھگوان داس، خدا بخش لائبریری بانکی پور)

(۲) مرزا محمد حسن اصل آں جناب از خاک ہندوستان است در ۱۱۷۲ھ تولد آں اصح البلاغار در شاہ جہاں آباد اتفاق افتاد و تا عمر ہفت دو سالگی از طبع خداداد عربی و فارسی تحصیل ساختہ طبیعت عالی پیدا کرد ..." (نشتر عشق مرتبہ عاشقی عظیم آبادی)

(۳) قتیل دہلی کے کھتری تھے انھوں نے اسلام قبول کیا ہے اب لکھنؤ میں رہتے ہیں اور فارسی کے بہترین عالموں میں ہیں (تذکرہ خوب چند ذکا[2])

(۴) اسم نامی آں ..... مرزا محمد حسین است، مولد گرامیش شاہ جہاں آباد، و اجدادش ساکن قصبہ پٹالہ، قوم کھتری بودہ اند۔ خیلے آزادانہ بسر می برد تا آں کہ از شاہ جہاں آباد برآمدہ بہ لکھنؤ پیوست، در ۱۲۰۲ھ بعمر شصت سالگی در لکھنؤ ودیعت حیات سپرد ... (معراج الخیال، میر وزیر علی۔ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ)

(۵) نامش مرزا محمد حسن است، از خوش معاشان قصبہ پٹالہ بودہ اند، مولد او و پدر بزرگوارش از خاک شاہ جہاں آباد برنگاشتہ اند، بہ عمر شصت و چند سالگی در ۱۲۳۳ھ ودیعت حیات سپرد" (ریاض الافکار۔ عبرتی عظیم آبادی، کتاب خانہ مولانا ظفر الدین قادری)

(۶) قتیل مرزا محمد حسن کا تخلص ہے یہ دہلی کا رہنے والا مذہبًا ہندو اور نسلاً کھتری تھا لیکن بعد کو مسلمان ہو گیا یہ اردو فارسی کا بہترین شاعر تھا لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کی حکومت کے زمانہ میں ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں انتقال کیا"

(ترجمہ از ڈاکٹر نیل بالی گرونی کل ڈکشنری)

(۷) ابو طالب مرتب تذکرہ خلاصۃ الافکار نے قتیل کو ساکن شاہجہاں آباد لکھا ہے افسوس کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ ہندوستان کے جس کتب خانے میں ہے وہاں سے قتیل کے تذکرہ کی نقل نہیں آسکی، یہ کتاب میری نظر سے گزر چکی ہے اس وقت محض اپنی یادداشت

---

[1] رائے لال جی، قیاسی اضافہ ہے، سفینہ، کا جو مخطوطہ ہمارے زیر مطالعہ رہا ہے وہ بدقسمتی سے کرم خوردہ ہے، ناظرین میں اگر کسی صاحب کی اس کتاب تک رسائی ہو تو براہ کرم مطلع فرمائیں — [2] اس تذکرہ کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے اور ایک ہندوستان میں یہ مدت ہوئی ہماری نظر سے گزرا تھا لیکن ہمارا موجودہ بیان اسپرنگر سے ماخوذ ہے، انڈیا آفس کی فہرست کتب فارسی جلد دوم کے مرتب نے تذکرہ کی ابتدا کا سال ۱۲۰۸ھ یا ۱۲۱۲ھ لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ اس کی ابتدا ۱۲۰۲ھ یا اس سے کچھ پہلے ہو چکی تھی لیکن نظر ثانی کا کام ۱۲۰۷ھ تک ہوتا رہا۔

سے کام لے رہا ہوں۔

(۸) خواجہ محمد علی تمنا عظیم آبادی نے ایک ضخیم بیاض[1] فارسی شعرا کی مرتب کی ہے جس میں قتیل نے خود اپنے ہاتھ سے ایک دیباچہ لکھا ہے اس میں قتیل کو دہلوی لکھا ہے۔

(۹) صاحب مجموعۂ سخن، نے بھی اسے دہلوی ہی لکھا ہے۔

اوپر کے بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قتیل کا وطن فرید آباد نہیں بلکہ دہلی تھا اور یہ دلایل ثبوت کے لئے کافی ہیں لیکن ہم ایک قدم اور آگے رکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خود مرزا قتیل نے اپنے بارے میں کیا لکھا ہے۔

(۱۰) مرزا قتیل کا ایک فارسی شعر ہے:

گرچہ باشد مولدِ من خاک دہلی اے قتیل — کم کسے چوں من زیزد و ایرواں برخاست است

جب وہ خود اپنا مولد خاک دہلی بتاتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے صحیح نہ مانیں۔ لیکن ممکن ہے کوئی صاحب فرمائیں، صاحب یہ تو شعر و شاعری کی باتیں ہیں، شعر میں آدمی کیا کچھ نہیں کہہ جاتا ہے، ان کے لئے ایک دوسری صاف اور واضح سند بھی پیش کرتا ہوں جس کے بعد شبہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

(۱۱) قتیل نے مولوی سلامت اللہ کے نام جو ایک طویل رقعہ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو "دہلی" سے کیسی محبت تھی، کیا یہ جذبہ حب وطن کے سوا کچھ اور ہے؟ اس کے رقعہ کے چند جملے یہ ہیں:

"..... داخل شہر شدہ بہ پاس خاطر داعیِ آثم روزے رونق افزائے مسجد فتحپوری شدہ و کاکین بازار قریب مسجد مذکور را از طرف من سلامے و در و دیوار شہر را اشتیاقے رسانیدن ضرور، و از منایات دلی بعید نہ خواہد بود بہ خدا کہ من بر ہر کوچہ و ہر خانہ آں شہر عاشقم" (صفحہ ۲۰۹)

(۱۲) اسی رقعے کی ابتدا میں ایک جملہ ہے: "شاہ جہاں آباد مولد و موطن فقیر است" شاہ جہاں آباد، دہلی کا قدیم نام ہے، میں سمجھتا ہوں کہ قتیل کی وطنیت دہلی پر اب اس سے زیادہ روشن اور واضح دلیل نہیں لائی جا سکتی اور نہ اس سے بہتر حجت قایم کی جا سکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب اچھی طرح سے ثابت ہو چکی کہ قتیل کا وطن دہلی تھا جو اصحاب اس بات کے مدعی ہوں کہ وہ فرید آبادی تھا انھیں اس کا معتبر ثبوت معاصرین کے بیانات سے دینا چاہئے، مجھے تو تذکرہ و تاریخ کا کوئی بیان ایسا نہیں مل سکا جس سے اسکی وطنیت فرید آباد ثابت ہو سکے، وطنیت تو بعد کی چیز ہے قتیل کا تو قیام فرید آباد بھی متحقق نہیں۔

قتیل نشتر عشق کے بیان کے مطابق ۱۱۷۲ھ میں پیدا ہوا، اور جمہور کے قول کے مطابق ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی، اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس مدت میں کدھر رہا اور کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہا:

(۱) عاشقی کا بیان ہے کہ قتیل کی پیدائش ۱۱۷۲ھ میں دہلی میں ہوئی: "در ۱۱۷۲ھ تولد آں در شاہ جہاں آباد اتفاق اُفتاد" ۱۱۷۲ھ

(۲) ۱۸ سال کی عمر تک یعنی تقریباً ۱۱۹۰ھ تک وہ تحصیل علم کرتا رہا یا تو دہلی رہا یا فیض آباد گو نتائج افکار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے

---

[1] یہ بیاض جس پر قتیل کی دستخطی تحریر ہے ہمارے مکرم دوست قاضی محمد سعید صاحب کی ملکیت ہے اور اسوقت فقیر کے کتب خانے میں موجود ہے

کہ عربی و فارسی کی تکمیل اس نے دہلی میں کی ص ۲۵۱

(۳) ۱۱۹۰ھ میں فیض آباد میں شہید کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ مصحفی کا بیان ہے: در ایامے کہ متعلقانش بحسب آنجور فیض آباد رفتہ استقامت گرفتہ بر دست شہید نیز دہ سالہ بود کہ مشرف اسلام پیوستہ (عقد ثریا ص ۴۶) (۱۱۹۰ھ)۔
مسلمان ہونے کے بعد گھر بار چھوڑ کر الگ ہو گیا اور ایک زمانہ تک اطراف شاہ جہاں آباد میں نجف خاں کے لشکر کے ساتھ گھومتا رہا۔۔ اہل بیت خود را خیر باد گفتہ کنارا جست و آزادانہ قدم بہ راہ تجرید نہادہ تا مدت در اطراف شاہ جہاں آباد بہ لشکر ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں مرحوم می گشت (نشتر عشق صفحہ ۱۴۵۰)

(۴) مصحفی عقد ثریا میں فدائی مشہدی کے ترجمے میں لکھتا ہے کہ "مرزا محمد حسن قتیل کے ہمراہ چاندنی چوک میں اس کی زیارت کا اتفاق ہوا"۔ مرزا ابو علی فدائی نجبائے ایران سے تھا اور بہ تقریب تجارت اسلحہ وارد ہندوستان ہوا تھا۔ "چوں از دہلی مراجعت بہ وطن مالوف کرد در مشہد مقدس رسیدہ از اسپ افتادہ ودیعت حیات سپرد" اس کا سال وفات اواخر ۱۱۹۶ھ ہے اور چاندنی چوک دہلی کا مشہور محلہ ہے جہاں قتیل سیر کر رہا تھا۔ (۱۱۹۶ھ)

(۵) بیتاب کے ترجمے میں مصحفی لکھتا ہے کہ میں ۱۱۹۸ھ میں شاہ جہاں آباد سے لکھنؤ آیا، لیکن بہ سبب برہمی مزاج، لکھنؤ چھوڑنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ قتیل نے ان کی ڈھارس بندھوائی، موخر الذکر مصحفی کے بیان کے مطابق اس وقت نواب کی ملازمت میں آگیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ ۱۱۹۸ھ میں قتیل لکھنؤ میں موجود تھا۔

(۶) ابھی مصحفی کا تذکرہ مرتب بھی ہونے نہ پایا تھا کہ قتیل دہلی سے غائب نظر آتا ہے: "در ایام دوری آں آشنائے صادق... تن تنہا قدم در بادیۂ تلاش اشعار و احوال .... مسودہ سرگزشت ہر یک را بر پارۂ کاغذی نگاشتم"، عقد ثریا ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوئی، زہے باغ باصفا، مادۂ تاریخ ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۱۹۹ھ میں وہ دہلی سے غائب ہے۔

(۷) تذکرۂ ہندی میں مصحفی نواب مہربان خاں رند کے ذکر میں لکھتا ہے: "فقیر حسب اتفاق روزے اتفاق روزے برائے دیدن آں بزرگ ہمراہِ مرزا قتیل در رستم نگر بر مکانش گزر افگندہ بود" (ص ۱۰۱) اس سے معلوم ہوا کہ قتیل زمانہ ترتیب تذکرۂ ہندی لکھنؤ میں موجود تھا تاریخ اختتام تذکرہ ۱۲۰۹ھ ہے لیکن اس کی ترتیب کا کام ۱۲۰۱ھ سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

(۸) تذکرہ خلاصۃ الافکار میں قتیل کے ذکر میں لکھا ہے "بہ عافیت و صحت بہ معاشرت شاگردان و دوستان در بلدۂ لکھنؤ بسر می برد" اس تذکرہ کی ترتیب کا کام ۱۲۰۶ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۰۷ھ میں ختم ہوا، ابو طالب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قیام کچھ دنوں سے تھا 'بسر می برد' سے یہی پتا چلتا ہے کہ وہ دو چار برس سے لکھنؤ میں مقیم تھا۔

(۹) خواجہ محمد علی تمنا عظیم آبادی خلف خواجہ عبداللہ تائید عظیم آبادی متوفی ۱۲۰۶ھ نے جو نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے سکریٹری تھے۔ ایک ضخیم بیاض فارسی شعرا کی مرتب کی ہے جس پر قتیل نے اپنے ہاتھ سے ایک دیباچہ لکھا ہے، اس کے چند جملے یہ ہیں: "قتیل بے سر و پا گوید کہ چوں در سال ہزار و دو صد دوازدہ ہجری بہ ملاقات شریف خواجہ محمد علی تمنا خلف ارشد خواجہ عبداللہ تائید .... در لکھنؤ بدولت خانہ خانہ صاحب عبدالقادر خاں بہادر اتفاق افتاد"۔ اس بیان کے غلط ماننے کی کوئی وجہ نہیں، انڈیا آفس کی فہرست کتب فارسی جلد دوم میں مشہور واقعات اور شعراء

اکابر کے سنین ولادت و وفات وغیرہ دئے ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۲ھ میں عبدالقادر خاں کارکن ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام جان ہمڈن کی معیت میں لکھنؤ میں تھا - بہرحال ۱۲۱۲ھ میں عبدالقادر لکھنؤ میں موجود تھا، اب رہا اس کے اور قتیل کے تعلقات کا حال، سو اس کا ثبوت بھی ملاحظہ ہو:

نہر الفصاحت کے رقعہ (۲۶) میں قتیل اپنے کسی عزیز کو لکھ رہا ہے کہ تمہارا سفر کلکتہ اور خاں صاحب مولوی عبدالقادر خاں کی وساطت سے مسٹر جان ہمڈن سے ملاقات کا حال معلوم ہوا "چوں ایں بے سروپا را با خانصاحب ممدوح نیازے و اخلاصے است..." اس سے معلوم ہوا کہ قتیل ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا اور وہیں مولوی عبدالقادر خاں کے مکان پر اسکی ملاقات تمنا سے ہوئی۔

(۱۰) چار شربت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں وہ کالپی گیا اور ڈھائی سال تک وہاں مقیم رہا، صاحب تذکرہ شمع انجمن کے قول کے مطابق وہ عماد الملک کا مصاحب تھا[1] - تذکرہ نتائج الافکار میں بھی یہی ہے کہ کچھ دنوں کالپی رہے اور بخیر و بی بسر کی -

(۱۱) چار شربت میں وہ خود لکھتا ہے کہ ۱۲۱۷ھ میں کالپی سے لکھنؤ واپس لوٹا -

(۱۲) حسین قلی خاں عاشقی تلمیذ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی کا بیان ہے :- "..... الحال از عرصۂ سی و شش سال بہ لکھنؤ تشریف می دارد، واز پانزدہ سال بہ سبب خلت و اتحاد مرزا شجاعت علی خاں مشہور بہ آغا صاحب کہ مختار سرکار دولت مدار مرشد زادہ آفاق مرزا سکندر شکوہ بہادر بہ دولت شاہ زادۂ ممدوح استقامت پذیر است"۔

"بعد تحریر احوال ناگہاں خبر جاں گداز رسید کہ آں فصاحت گیش بہ مرض استسقا بہ تاریخ بست و سوم ربیع الاول در لکھنؤ ودیعت حیات سپرد"۔

عاشقی یہ سطریں قتیل کی بالکل آخری عمر میں لکھ رہا ہے[2] اس کا سال وفات ۱۲۳۳ھ ہے اگر اس سے ۱۵ سال نکال لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قتیل تقریباً ۱۲۱۸ھ میں سکندر شکوہ کے مصاحبوں میں داخل ہو چکا تھا۔

(۱۳) منیر علی خاں حریق اپنے ایک عربی مکتوب میں مولوی حیدر علی کو لکھتے ہیں :

"یا مخدومی، انی ذھبتُ یوما مع قدوۃ الفصحاء، وزبدۃ البلغاء..... المسمی بمحمد حسن المتخلص بالقتیل فی دار السید الشریف الذکی المدعو بانشاء اللہ خاں ..... فقال السید قد وجدت قصیدۃ من قصاید مولانا حیدر علی وجعلت اشعارہا مخمسۃ لا قلت اقرار فقرار، فاخذتہا عن السید وطالعتہا وتمیت النظر الی طرفہ البیت ؎

سو ہے امر تم کو بھی صلوا وسلموا تسلیم ہے امتثال امر کا واجب اے رمنان مدام

فقامت فی المراع الثانی وما فہمت وزنہا لقلۃ المعرفت بعلم العروض اسئل عنکم ان اعلمونی وزن ہذا المذاع و تقطیعہ،

انشا کا مخمس ہماری ایک بیاض میں موجود ہے جو ۱۲۲۰ھ کا مکتوب ہے، مولوی حیدر علی خاں وہی ہیں جس کا ذکر انشا نے دریائے لطافت میں کیا ہے[3]۔ یہ ایک انگریز قاموس نگار[4] کے قول کی بنا پر فیض آباد کا رہنے والا تھا، لکھنؤ کے قیام کے بعد دہلی

---

[1] مصنف کا یہ بیان صحیح نہیں ہے ۱۲۱۵ھ سے بہت پہلے عماد الملک کا انتقال ہو چکا تھا۔ شاید اس کی مراد اخلاف عماد الملک سے ہو۔ [2] اس تذکرہ کی ترتیب کا کام ۱۲۲۳ھ میں شروع ہوا اور اس کی تکمیل چہارشنبہ ۱۳ رجب ۱۲۲۳ھ کو ہوئی [3] دریائے لطافت مطبوعہ ۱۹۰۱ء صفحہ ۷۸ و ۷۹ نسخہ مراد آباد صفحہ ۴۹ - [4] انبیل صفحہ ۱۴۹ -

چلا گیا اور عمر بھر وہیں رہا، ۱۲۵۴ھ میں دہلی میں موجود تھا، سال وفات کا ہمیں علم نہیں لیکن اس کا تعین کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے اس مکتوب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکتوب لکھتے وقت لکھنؤ سے جا چکا تھا ایک تو انشا کا قدوجدت قصیدہ من قصاید حیدر علی کہنا، پھر حریق کا اسے خط لکھنا، پھر اس مکتوب کا ایک جملہ ہے: "فقدت اسباب جلوس احدہم بالآخر بالاطمینان والفراغ ..... ہذا فراق بینی وبینکم" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں حریق و حیدر علی کی جو صحبت تھی وہ اُجڑ چکی تھی۔ اب صرف ایک چیز معلوم کرنا ہے کہ حیدر علی دہلی کب گیا اور اس نے لکھنؤ کب چھوڑا اس مکتوب کی تاریخ کتابت اور انشا کے مکان میں قتیل کی موجودگی کی تاریخ خود بخود نکل آئے گی۔ اس اطلاع کے لئے ہم مصنف مخزن الغرائب کے ممنون ہیں، اس کا بیان ہے کہ یہ سطریں لکھتے وقت حیدر علی دہلی میں مقیم ہے، اس تذکرے کا سال ترتیب ۱۲۱۸ھ ہے، معلوم ہوا اس مکتوب کی تاریخ تحریر بعد از ۱۲۱۸ھ ہے اور قبل از ۱۲۲۰ھ یعنی تقریباً ۱۲۱۹ھ ہے، معلوم ہوا قتیل ۱۲۱۹ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔

(۱۴) دریائے لطافت کی ترتیب میں قتیل کا بڑا ہاتھ تھا اور نصف ثانی جو منطق، عروض و قوافی اور بیان و بدیع پر مشتمل ہے، کلیتاً اس کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب کی ترتیب ۱۲۲۰ھ کے بعد شروع ہوئی اور تکمیل ۱۲۲۲ھ میں ہوئی یہ وہ زمانہ ہے جب سعادت علی خاں مسند اودھ پر رونق افروز تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۱۲۲۱ھ ۱۲۲۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔

(۱۵) آزاد نے رنگی کے حوالے سے لکھا ہے! مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا انشا، قتیل، مصحفی وغیرہ سب شعرا جمع ہوتے تھے ناسخ جاتے سب کو سنتے مگر وہاں خود کچھ نہ پڑھتے (آب حیات صفحہ ۳۴۵)

مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرے کب ہوتے تھے اس کی ہمیں خبر نہیں لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ انشا قتیل کی روایت کی بنا پر ۱۲۲۵ھ میں خانہ نشین ہو گیا تھا، اس مجمع میں جرأت بھی نظر آتا ہے اس کا سال وفات نئی تحقیق کی بنا پر ۱۲۲۴ھ ہے، یہ مشاعرے ظاہر ہے کہ ۱۲۲۴ھ یا اس سے لگ بھگ منعقد ہوا کرتے تھے جب کہ میر کے آخری ایام تھے اور ناسخ کا ابتدائی دور۔ (۱۲۲۴ھ)

(۱۶) معدن الفوائد مرزا قتیل کے اُن رقعات کا مجموعہ ہے جو خواجہ امام الدین امامی نے اس کی زندگی ہی میں مرتب کیا ہے، اس میں ایک مکتوب ہے قتیل رقم طراز ہے: آقا صاحبان مخدوم و مکرم بہ خیریت اند دنا ہر سنگھ بہ کوٹھی ہستند دمن بہ نخاس درخانۂ شما" نخاس لکھنؤ کا ایک محلہ ہے اور یہ مکتوب ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۱۷) ایک دوسرے مکتوب کے چند جملے یہ ہیں: "پری روز کہ شنبہ غرہ ربیع الثانی ۱۲۲۸ھ بود عرضۂ شما و خطے کہ اسمی من بود در حویلی نخاس ہمیکہ از حضور بہ ایں تقریب کہ فردا روز مشاعرہ است رسیدم بہ مطالعہ در آمد" اس سے معلوم ہوا کہ ۱۲۲۸ھ میں وہ لکھنؤ میں موجود تھا۔

(۱۸) لیکن ۱۲۳۱ھ میں ہم اسے پھر کالپی میں موجود پاتے ہیں۔ مظہر العجائب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران تالیف کتاب میں وہ عماد الملک کے یہاں کالپی میں ٹھیرا ہوا تھا، یہ کتاب ۱۲۳۱ھ میں لکھی گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں وہ کالپی میں موجود تھا۔

(۱۹) "عرض اقدس می رساند کہ شب شنبہ برات بندہ زادہ مکرم اال بودہ در مکانے کہ بر چوپٹیا فروکش کردہ ام، امید دام

کہ امروز یا فردا برائے ایک دو ساعت اگر غلام نوازی فرمائید موجب افتخار است "

مکتوبات امرت لال کے اس قلمی نسخے کی ابتدا میں کچھ اور سادہ اوراق ہیں جن پر کچھ ریختہ کے اشعار کچھ تاریخیں، کچھ مقوی اور مبہی نسخے درج ہیں ایک قطعہ تاریخ لکھن لال کی شادی کا بھی ہے جس سے صنعتِ تعمیہ میں ۱۲۳۲ نکلتے ہیں، تقریب شادی لکھنؤ میں انجام پائی، معلوم ہوا کہ قتیل ۱۲۳۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔

(۲۰) اس کا سال وفات صحیح قول کی بنا پر ۱۲۳۳ھ ہے اور اس امر پر تمام مورخین اور تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ اس کی وفات لکھنؤ میں ہوئی، دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ قتیل کس سنہ میں کہاں رہا: ۔ ۱۱۷۳ھ (دہلی)۔ ۱۱۹۰ھ تک دہلی یا فیض آباد۔ ۱۱۹۶ھ میں، دہلی ۔ ۱۱۹۸ھ لکھنؤ ۔ ۱۱۹۹ھ دہلی سے باہر غالباً لکھنؤ ۔ ۱۲۰۱ھ تا ۱۲۰۹ھ کے درمیان کسی ایک وقت لکھنؤ ۔ ۱۲۰۶ھ کے دو چار برس پہلے سے لکھنؤ ۔ ۱۲۱۲ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۱۵ھ کالپی ۔ ۱۲۱۸ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۱۹ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۱۹ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۲۱ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۲۲ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۲۴ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۲۷ھ لکھنؤ۔ ۱۲۲۸ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۳۱ھ کالپی ۔ ۱۲۳۲ھ لکھنؤ ۔ ۱۲۳۳ھ لکھنؤ میں موجود تھا۔

اب مجھے بتایا جائے کہ آخر اس کا قیام فرید آباد میں کب تھا، نہ اس کا قیام وہاں ثابت نہ اس کے باپ کا قیام متحقق، نہ وہ وہاں پیدا ہوا نہ اس کے باپ کی پیدائش وہاں ہوئی۔ نہ وہ وہاں مرا اور نہ اس کے باپ کی وفات وہاں ہوئی۔ آخر یہ فرید آباد اس کا وطن کیسے ہوگیا ؟

مختار الدین احمد آرزو ۔

مغل لائن لمیٹڈ

لڑائی کے زمانہ میں ہمارے ان جہازوں کے اوقات بہ سامان اور مسافروں کو عدن، جدہ، پورٹ سوڈان، مصر اور ماریشس تک لیجاتے تھے، مجبوراً بے قاعدہ ہوگئے ہیں، لیکن صلح اور فتح کے بعد کمپنی کے تمام جہازوں کی آمد و رفت پھر باقاعدہ ہوجائے گی اور مسافروں اور سامان بھیجنے والوں کے لئے بدستور سابق پھر آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔

ٹرنر مارین اینڈ کو

منیجنگ ایجنٹس مغل لائن کمپنی

۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

اُسلوب بیان

ادب یا انشا کے سلسلہ میں روش نگارش کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے اور در اصل کسی ادیب یا انشا پرداز کی کامیابی کا دارومدار بڑی حد تک اسی روش نگارش پر ہے۔ انگریزی ادب و زبان کے ایک مشہور ادیب نے اُسلوب بیان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے "ایک انشا پرداز کے لئے اسلوب بیان کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے ایک فرد واحد کے لئے اس کے اپنے اوضاع و اطوار اور حرکات و سکنات۔ اس لئے یہ کہنا کسی طرح بیجا نہیں کہ اسلوب بیان درحقیقت انسان ہے۔ جس طرح عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اوضاع و اطوار سے انسان انسان بنجاتا ہے"

زبان، ادائے خیالات کا ایک ذریعہ ہے اس لئے ہم زبان کو خیالات و افکار سے برتر یا بالاتر تو نہیں کہہ سکتے اور خاص اس باب میں ہمارے عام مصنفین اور ارباب فکر و ادب نے جن انوکھے خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں کسی طرح بھی صحیح نہیں قرار دے سکتے البتہ زبان کی اہمیت اور وہ بھی ادائے مقاصد، اظہار خیالات، اور بیان افکار کے پیش نظر بہر حال مسلم ہے۔ اور چونکہ اسلوب بیان نام ہے خیالات کو مخصوص طریق پر ادا کر دینے کا اس لئے اسلوب بیان کی اہمیت، جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا، زبان کی اہمیت کے مساوی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ درحقیقت زبان کی اہمیت ہے۔

زبان کی ابتدا، زبان کا ارتقا اور سب سے آخر میں اس کا زوال اور انحطاط بالکل اسی طرح ہوتا ہے اور ٹھیک ان اُصول کے مطابق جو انسان بلکہ جملہ ذیحیات اشیاء کے ارتقاء، تکوین اور انقلاب میں حصہ لیتے ہیں۔ اگر انسان یک بیک اپنی تمام قوتوں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ زمین پر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور خود زمین بھی اپنی موجودہ شکل و صورت اور سکون آفریں گرد و پیش کے ساتھ بیکدفعہ آفتاب عالمتاب کے گرد کسی پروانہ کی طرح چکر نہیں لگا سکتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ زبان اپنے گوناگوں اسالیب بیان اور بوقلموں روشہائے نگارش کو لئے ہوئے ظہور میں آئے۔

دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کا لٹریچر پڑھئے۔ ان کے ارتقائی دور اور عہد قایم کیجئے اور پھر ان ادوار کی امتیازی خصوصیات پر غائر نگاہ ڈالئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ سحر بداماں گلشن کی سیر کر رہے ہیں جس میں خوش رنگ، خوش بو اور خوش ورق پھول شاخوں پر کھلے ہوئے ہیں اور وہ سب ایک دوسرے سے اس درجہ مختلف، اس درجہ متباین اور جدا جدا ہیں کہ کوئی ایک دوسرے، کی نقل، ایک دوسرے کا عکس اور ایک دوسرے کا چربہ معلوم نہیں ہوتا۔

یہ "جنت نگاہ" گلشن قدرت کی نادرہ کاری کا ایک نمونہ ہے اس لئے بہر حال ترقی یافتہ زبانوں کا ادب جو "فردوس گوش" کہا جا سکتا ہے، قدرت کی اس نادرہ کاری کی مثال ہونا چاہئے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ ہمارے خوش فکر نوجوان ادیب جو

بمقتضائے ع گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

اُردو زبان اور اس کے تنک متاع ادب کو سنوارنے اور نکھارنے کی سعی و کوشش کر رہے ہیں خاص طور پر اس کا خیال رکھیں کہ کہیں وہ اس عروس نوکو ان وحشی بادیہ نشین قبایل کی طرح بھدا، کریہ المنظر اور قبیح صورت تو نہیں بنا رہے ہیں جو اپنی دلہنوں کو زیب و آرایش کے جنون میں از سر تا پا زیور اور گہنے پاتے سے لاد کر ان کے نرم و نازک جسم کے ہر حصہ کو نیلگوں نقش و نگار سے گدوا کر حد درجہ گھناؤنا اور بدرجہ غایت بھدا بنا ڈالتے ہیں۔

اس لئے آیئے ذرا ان زبانوں کے ادبیات اور ان کے اسالیب بیان پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں اور اس کی ارتقائی تاریخ کے اوراق میں دیکھیں ہمارے لئے کیا اسباب پنہاں ہیں۔

انگریزی ادب جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایک بڑی حد تک یونان و روما کا شرمندۂ احسان ہے۔ اس ادب کے حامل، مربی اور انشا پرداز بیشتر ہومر، ورجل، پلوٹارک ایسے سخن گو اور سخن سنجوں کی آغوش میں تربیت پا چکے تھے۔ اس لئے طبعی طور پر وہ ان کے رنگ میں ڈوب گئے۔ انھوں نے ادب و انشا کے جو پھول تراشے ان میں رنگ وہی بھرا جو ان کے اُستادوں نے ان کے لئے طیار کیا تھا۔ اس لئے ان کے تراشے ہوئے پھول تیز رنگ ضرور تھے لیکن خوش رنگ نہ تھے۔ ان کے پھولوں کی پنکھڑیاں اور ان کا کٹاؤ کسی قدر خوشنما ضرور تھا لیکن یہ پنکھڑیاں انگلستان کی آب و ہوا میں زیادہ عرصہ تک شاداب نہیں رہ سکتی تھیں۔ ایک زمانہ آیا کہ ان کے پھول پھیکے پڑ گئے۔ ان کا رنگ بو کے ساتھ اُڑ گیا۔ ان کی پنکھڑیاں مرجھا گئیں۔ ان کی کیکریاں اور کٹاؤ بگڑ کر بدنما ہو گئے۔ انھوں نے نقالی کے شوق میں آب و ہوا کی سازگاری ماحول کی صلاحیت اور گرد و پیش کے تقاضے کا خیال مطلقاً نہ کیا اس لئے ان کا حشر آج ہمارے سامنے ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ اور ان کے ادبی کارنامے جنھیں میں تیز رنگ پھول کے نام سے یاد کر رہا ہوں کس اسلوب بیان سے تعلق رکھتے ہیں یہ "کلاسیکل اسکول" کے طالبعلم ہیں اور ان کے ادبی نوادر کلاسیکل اسٹائل یعنی "طریقہ درسیہ" یا "اسلوب مدرسی" میں لکھے گئے ہیں۔

اس اسکول کی خصوصیات بہت ہیں اور اس فرصت میں ان تمام خصوصیات کا ذکر ذرا دشوار ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبارت کی رنگینی، تراکیب کی رعنائی اور خواہ مخواہ ثقیل، بھاری بھرکم، اور غریب و نامانوس الفاظ کی بھرمار، صنائع و بدائع کے انبار، لفظی مناسبتیں، اور غیر ضروری دور از کار التزامات اس اسلوب بیان کے ترکیبی عناصر ہیں۔

یہ اسلوب بیان سراسر غیر فطری ہے، اس سے غالباً کسی صاحب ذوق و نظر کو انکار نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یقینی ہے کہ جس قدر یہ غیر فطری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے اس لئے قدرتی طور پر دشوار پسند طبایع اور اہل علم و فضل نے اس طریقہ کو اپنی جولانگاہ بنایا اور خوب خوب قدرت کلام، جودت طبع اور بلندیِ دانش و ذکا کے مظاہرے کئے۔

اس کے مقابلہ میں اور گویا ردعمل کے طور پر انگریزی ادب کے حاملین میں ایک جماعت کا پیدا ہو جانا یقینی تھا۔ جو اپنے پیشرو انشا پردازوں کی طرح محض اجنبی زبان کے اہل قلم اور ارباب تحریر کی تبع نہ ہو بلکہ اپنے ملک کے حالات و مقتضیات پر بھی اس کی نگاہ ہو۔

یہ جماعت انگلستان میں "رومینٹک اسکول" کے نام سے موسوم ہے، اس اسکول کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ

کبھی یہ فراموش نہیں کرتے کہ زبان ایک آلہ ہے محض خیالات و افکار کے واضح طور پر ادا کر دینے کا اور جس قدر یہ خیالات واضحًا اثر و قوت کے ساتھ ادا کئے جائیں گے اسی قدر زبان کی آفرینش کا مقصد بجا طور پر حاصل ہوگا۔ اس اسکول کے نمایندوں نے زبان اور طرز ادا کی تحسین و تزئین میں اسی حد تک حصہ لیا جس حد تک یہ ممکن تھا کہ اس کے سنوارنے کے ساتھ ساتھ اس میں زور، اثر اور قوت بھی پیدا کی جا سکے۔ یہ بزرگ بجا طور پر اپنی فطری قوتوں سے کام لیتے رہے۔ ان کے بنائے ہوئے پھول فطری رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس لئے صحیح طور پر باصرہ نوازی بھی کرتے ہیں اور شامہ نوازی بھی۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ بہر حال اسلوب مدرسی یا کلاسیکل اسٹائل تقلید و تتبع کی پیداوار ہے۔ اگر ایسا ہے تو دنیا کے قدیم ترین آداب کی بابت کیا کہیں گے ہم بہر نوع اپنے علم کے مطابق یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ رنگ ان میں بھی مستعار و ماخوذ ہے اس کی ایک مثال، خود روم و یونان کے ادبی کارنامے ہیں جن کا ذکر سطور بالا میں باختصار کیا جا چکا ہے۔

دوسری مثال سنسکرت لٹریچر ہے۔ آپ یہاں بھی یہی دو اسلوب پائیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سنسکرت ادبیات میں کلاسیکل اسکول کا وجود رومینٹک اسکول سے پیشتر ہے۔

سنسکرت میں کلاسیکل اسکول کو "ویدربھی" اور رومینٹک اسکول کو "دھنی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سنسکرت کی ایک مشہور کتاب "سنگیت رتناکر" میں لکھا ہے: "مارگو۔ دلیشی۔ تی۔ چ۔ دوے دھا۔ تتر۔ مارگ۔ ساچتیتے"

یعنی سنسکرت شاعری کے دو اسکول کہے جاتے ہیں ایک مارگ دوسرے دلیشی۔ اس کے بعد مصنف نے ان دونوں اسکولوں کی جو خصوصیات شمار کرائی ہیں وہ سراسر کلاسیکل اور رومینٹک اسکول کی خصوصیات ہیں۔

سنسکرت میں "دامن" اور "ونڈن" کلاسیکل اسکول کے دو بڑے ہیرو ہیں۔ دامن کا مشہور قول ہے:

ریتیر۔ آتما۔ کاویسیہ ۔ ریتی یعنی اسٹائل شعر و سخن کی روح ہے۔

اس کے مقابلہ میں دھنی اسکول کے نمایندے رس یعنی خیالات و افکار کو شعر و شاعری کی روح بتاتے ہیں۔

جن اصحاب نے ونڈن کی مشہور کتاب "دش کمار چرتم" دیکھی ہے وہ ویدربھی اسکول کی خصوصیات کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سنسکرت کے مشہور و معروف رزمیہ شاہکار رامائن اور مہا بھارت جو ویدانگ کے بعد قدیم ترین شاعری کے نمونے ہیں، دھنی یا دلیشی اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔

عربی ادب میں بھی قدیم سے دو جدا جدا اسلوب رائج تھے۔ اور وہ یہی دو اسکول تھے، جن کا ذکر سنسکرت اور انگریزی اصطلاحات کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

قرآن شریف کی مکی سورتیں کلاسیکل انداز میں ہیں اور مدنی سورتیں یکسر رومانی ہیں لیکن اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے بعد عرب اور ممالک اسلام میں جو بے بہا ادبی شہپارے آسمان میں بے شمار ستاروں کی طرح جگمگائے ان میں ان دو مختلف اسالیب بیان کا فرق بہت نمایاں ہے۔

عبداللہ بن مقفع، عبدالحمید ابن یحییٰ الکاتب، الجاحظ اور ابن قتیبہ رومانوی اسلوب کے فروغ دینے والے ہیں۔

در اصل عربی میں مدرسی اسلوب کا رواج بنو عباس کے دور سوم سے ہوتا ہے۔ جرجی زیدان کا خیال ہے کہ اس طبقہ کا امام اس دور میں مشہور ادیب ابن الحمید ہے۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جرجی زیدان کے نزدیک عربی ادب میں کم سے کم کلاسیکل اسٹائل کا رواج یا فروغ براہ راست عیش پرستی، تن آسانی اور تانق کا نتیجہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"والرخاء یدعوالی التانق فتطرق ذالک الی انشائھم فصاروا یتنا قون فیہ کما یتنا قون بلباسہم وطعامہم واثاثھم فاطالوا العبادۃ وتوسعوا فی التنمیق"

یعنی تن آسانی اور راحت پسندی بہرحال تانق کا سبب بنجاتے ہیں۔ اور یہ تانق جہاں کھانے پینے اور لباس یا فرنیچر وغیرہ میں جلوہ افروز ہوتا ہے وہاں انشاد ادب بھی اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اگر یہ شوق زیبائی اسی حد تک رہتا کہ زبان کی قدرتی خوبیاں زیادہ اجاگر کی جاتیں۔ اس کے خط و خال زیادہ روشن کئے جاتے یا زیادہ سے زیادہ اسے مناسب اور موزوں زیوروں سے سجایا جاتا تو چنداں معیوب نہ تھا۔ لیکن اس والہانہ شوق زیب و زینت نے انھیں اس پر مجبور کیا کہ وہ قطعی ناموزوں اور سراپا بوجھل اور ثقیل زیوروں سے لاد کر اسے زیادہ مکروہ صورت بنائیں۔ اور پھر جذبۂ مسابقت نے اس شوق کو ہوا دیکر اور تیز بنا دیا۔ آج عربی ادب میں ایسے نمونے بھی ہیں جنھیں پڑھکر لذت اندوز ہونا تو بڑی بات ہے اور مزہ بگڑ جاتا ہے۔ جس ادب کو چٹخارے لیکر پڑھنا چاہیئے تھا آج وہ منھ بنا کر پڑھا جارہا ہے اور بدشواری حلق سے نیچے اُتارا جارہا ہے۔

فارسی ادب تو سراسر عربی ادب کا گویا ایک پرتو ہے۔ اس لئے فارسی نثر لکھنے والوں کے نزدیک عربی ادب کی وہی حیثیت ہے جو یونانی اور لاطینی ادب کو انگریزی میں حاصل ہے۔ لیکن فارسی کی ابتدائی تصنیفات جو سامانیہ، غزنویہ تا آنکہ سلجوقیہ عہد میں لکھی گئیں عربی اثر سے خالی ہیں اور یہی ایک چیز کافی ثبوت ہے اس امر کا کہ کلاسیکل اسلوب بیان ایک غیر فطری اسلوب ہے۔ جب کبھی فطرت کے سادہ لیکن مرغوب اور آزاد فضا میں کسی ادب کا نشوونما تقاضا ہوا وہ فطرت کے عام اور ہمہ گیر اُصول کے مطابق ہوا۔ چنانچہ فارسی لٹریچر کے ابتدائی شاہکار جو دراصل عربی ادب کے اثر سے آزاد ہیں، بہت ہی سادہ سلیس، رواں اور موثر انداز میں لکھے گئے ہیں۔

نظام الملک طوسی کا سیاست نامہ، ناصر خسرو کا سفر نامہ اور نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ سہل ممتنع فارسی نثر کے بہترین اور بلند پایہ نمونے ہیں۔ عربی مدرسی طرز تحریر کے اثر کی ابتدا فارسی میں تاتاریہ دور سے ہوتی ہے۔ اس عہد میں بیشتر تاریخ کی کتابیں لکھی گئیں اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی تصنیفات میں رعنائی کلام اور رنگین عبارت کی بہت کم گنجائش تھی لیکن اس عہد کی تقریبی طور پر تمام تصنیفات کلاسیکل اسٹایل میں لکھی گئی ہیں اور ان میں سے بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ انھیں لغات اور قوامیس کی مدد سے بھی بہ دشواری حل کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد خاص اس نوع کی کتابوں کو سامنے رکھ کر متعدد کتابیں مختلف فنون میں تصنیف ہوئیں۔ ان سے

مطالعہ سے اور کچھ نہیں تو اتنا سبق ضرور حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قدر دشوار ہیں اسی قدر کامیاب ہیں۔ تاریخ وصاف کے جواب میں کوکب کی درۂ نادرہ کی کامیابی کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ بے حد رنگین، حد سے زیادہ دقیق اور بدرجہ غایت دشوار ہے۔

ممکن نہیں کہ ان کتابوں کی تحریر کے نمونے آپ کے سامنے پیش کئے جائیں ورنہ آپ پڑھتے اور شاید تراکیب کی موزونیت الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت اور جملوں کے زیر و بم کے کیف میں ایسے محو ہو جاتے کہ رشتۂ مقصود ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور آپ کو خبر نہ ہوتی۔

بدبختی سے ہندوستان میں جب اُردو زبان جنم لے رہی تھی۔ یہاں کے اہلِ قلم اسی دقیق نگاری کے نشے میں سرشار تھے۔ ظہوری اور نعمت خانِ عالی کے خمخانے میں بادہ نوشوں کا ہجوم تھا اور ہر مے نوش کی زبان پر تھا:

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس ہونہار بچے نے اس فضا میں آنکھیں کھولیں اور تربیت بھی ایسے ہی نثر نگاروں کے آغوش میں پائی۔ اس لئے یہ بچہ چونچال ہونے سے پہلے ہی سنجیدہ ہو گیا۔ ذرا فطری شوخی نہیں، چلبلاپن نہیں، طنازی نہیں، صورت سنجیدہ اور متین، آنکھوں میں شرم و حیا ـــ وقار اور بزرگی کی مورتی۔

خیریت یہ ہوئی کہ ہندوستان کی فضا میں جو اس بچے کی تربیت گاہ تھا، عربی و فارسی کی رنگین موسیقی کے ساتھ کبھی کبھی اس بچے کو سنسکرت اور ہندی بھاشا کے شیریں اور سریلے گیت بھی سنائے جاتے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ بچہ اپنے فطری البیلے پن کو بالکل کھو بیٹھتا۔ اور پھر غالب، آزاد اور حالی کی گدگدیاں بھی اس کے جسم میں پھریری پیدا نہ کر سکتیں۔

سب سے پہلے میر امن نے اس بچے کے جسم سے ان گھنوں پاتوں کو اُتارا جنھوں نے اس کے نازک جسم کو گرانبار بنا رکھا تھا اور جن میں اس کی فطری شوخیاں اس طرح دب کر رہ گئی تھیں جیسے ایک سلگتی ہوئی چنگاری پر خاک ڈال دی جائے۔ ان گہنوں کے اُترتے ہی اس بچہ نے ایک جھرجھری لی اور اس کے جسم میں فطری صلاحیتوں کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ غالب سب سے پہلے مربی ہیں جنھوں نے اس بچہ کو عریاں کیا اور اس کے اصلی خط و خال ہماری نگاہوں نے دیکھے۔

غالب نے ایک ساتھ دو کام کئے۔ ایک یہ کہ بچہ کے جسم سے بھدے اور بھاری زیور نوچ نوچ کر پھینکے دوسرے یہ کہ اسے گدگدا کر شوخ بنایا۔ اگر غالب کے بعد سرسید پیدا نہ ہوتے تو یہ بچہ کبھی بڑا ہو کر اس لائق نہ ہوتا کہ دنیا کے کام کاج سنبھال سکے۔ اور گرہستیوں کی طرح ہر قسم کی ذمہ داری کا بار اپنے شانوں پر لے سکے۔

یہ کام سرسید نے کیا اور بہت خوب کیا۔ وہی بچہ جو غالب کے مکاتیب میں کھلونوں سے کھیل رہا ہے۔ زیر لب تبسم سے دیکھنے والوں پر بجلیاں گرا رہا ہے۔ مستانہ اداؤں، اشاروں اور کنایوں سے دلوں کو لبھا رہا ہے۔ سرسید کی تحریروں میں آکر شباب کی منزلوں میں قدم رکھتا ہے تو حد درجہ سنجیدہ اور متین بنجاتا ہے۔ سمجھ لیجئے غالب کے مکاتیب اس بچہ کا گویا عہد طفلی ہے اور سرسید کی انشا اس کا عہد شباب۔ اس لئے آپ اس میں سادگی، متانت، سنجیدگی اور وقار سب کچھ پاتے ہیں جو ایک نوجوان میں ہونا چاہئے۔

اس لحاظ سے سرسید کا کام سب سے بڑا کام ہے اور سرسید کا اسلوب بیان صحیح فطری اسلوب بیان ہے۔ سرسید نے

جس اسلوب کی بنیادیں رکھیں ان کے بعد حالی، شبلی اور نذیر احمد نے اُس کو زیادہ مستحکم اور زیادہ استوار بنایا۔ سنجیدہ نگاری اور سادہ نگاری کسی قدر ندرت اور لطافت کے ساتھ سرسید کے پیروؤں کی ایک بڑی خصوصیت ہے اور آج اگر اُردو زبان اور ادب کو کوئی ترقی دیجا سکتی ہے تو وہ صرف انھیں لائنوں اور خطوط پر دیجا سکتی ہے۔

ورنہ بہت ظاہر ہے کہ غالب کی شوخی ہر جگہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ غالب کی تقریظیں بھی تو اسی شوخ قلم کی تراوش ہیں پھر وہ شوخ کیوں نہیں۔ بے شک مولانا آزاد دہلوی کا اسلوب سادہ بھی ہے اور رنگین بھی۔ شوخ بھی ہے اور متین بھی۔ البیلا بھی ہے اور دلنشین بھی۔ لیکن یہ اسلوب بھی کہیں کہیں ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔ آبحیات اور نیرنگ خیال میں مولانا آزاد کامیاب ہیں۔

لیکن کیا ان کی دوسری تصانیف بھی اسی پایہ کی ہیں۔ کیا وہ ان میں بھی اسی طرح کامیاب ہیں۔ اس کا فیصلہ خود صاحبان ذوق فرمائیں۔ اس کے مقابلے میں شبلی اور حالی کی روش نگارش میں یکسانیت ہے اور یہی وہ روش ہے جسے ہمارے نوجوان ادیب بآسانی اختیار کرسکتے ہیں اور اس میں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

زبان خیالات کے اظہار کا آلہ ہے اس لئے اسے خیالات کا پابند ہونا چاہئے اگر خیالات بلند ہیں تو زبان بھی اسی قدر بلند ہو۔ اگر خیالات میں ندرت ہے تو زبان کی ندرت بھی ملحوظ ہونا چاہئے۔ یہ منشا ہے ان انشا پردازوں کا جو رومینٹک اسکول کے نمایندے ہیں اور یہی طریقہ فطرت کے اُصول و نوامیس کے مطابق ہے۔ صرف یہی طریقہ کامیاب ہوسکتا ہے اور صرف اسی اسلوب کو اختیار کرنے کے بعد اُردو زبان اور اُردو ادب کو ترقی دیجا سکتی ہے اور اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف اول میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

شوکت سبزواری ایم۔اے

نکسول

استعمال کرنے والے لوگ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے

اس لئے کہ

نکسول تمام مضر صحت اجزا سے پاک ہے اس میں جو اجزا استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت قیمتی ہیں، ان کے زندگی بخش خصائص حکیموں اور ڈاکٹروں کے نزدیک مسلم ہیں، یہی وجہ ہے کہ نکسول کو بوڑھے بھی استعمال کرسکتے ہیں اور جوان بھی اور سب بقدر ظرف فایدہ اُٹھاتے ہیں، آپ بھی تجربہ کیجئے۔

قیمت
بڑی شیشی ..... آٹھ روپے
چھوٹی شیشی ..... تین روپے

نیشن اینڈ ایلس
پراسپکٹ چیمبرس انیکس
فورٹ - بمبئی

اپنی یاد میں

دیوتاؤں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جسے عزیز رکھتے ہیں۔ اُسے دنیا سے جلد اُٹھا لیتے ہیں۔ دیویوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جس کو عزیز رکھتی ہیں اُسے کہیں کا نہیں رکھتیں، خود اپنے بارہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دیویوں کو عزیز رکھنے کا سودا بُرا نہیں! مجھے اپنی پیدائش اور وفات دونوں کا علم نہیں۔ ان دونوں سانحات کے وقت دنیا میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوا اور ظاہر ہے جب تک انقلاب نہ ہو کسی بات کی اہمیت نہیں۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ میں نے بھی تمام عمر انقلاب پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں نے شعر بھی تمام عمر نہ کہے۔ غلط البتہ پڑھ سکتا تھا۔ نثر لکھتا رہا۔ شاعری پر قدرت ہوتی تو انقلاب کچھ دور نہ تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری آتی ہو تو انقلاب پیدا کرنے کا امکان کم اور ارمان بڑھ جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی صحیح ہو۔ غرض تمام عمر میں اور انقلاب ایک دوسرے سے بدگمان رہے۔ میری زندگی میں شاعر انقلاب پیدا ہونے لگے تھے لیکن جس وقت میں نے ان کو چھوڑا ہے تو وہ سربکف تھے اور انقلاب سربگریباں!

میں نے نثر میں جو کچھ لکھا اور بکثرت لکھا وہ اُردو داں طبقہ کے سامنے ہے۔ میں نے ہر طرح کی زندگی بسر کی اور ہر طرح کے لوگ دیکھے۔ آپ منتظر ہوں گے کہ میں اپنے مضامین کے بارے میں کچھ اعترافات کروں۔ لیکن اعتراف کرنے سے پہلے میرے دل میں ایک بات کھٹکتی ہے۔ دل کی کھٹک میں مرنے کے بعد بھی ساتھ لایا ہوں۔ وہ یہ کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مرتے وقت آدمی جو کچھ بیان کرتا ہے وہ سچ ہو یا نہ ہو عدالت اُسے سچ تسلیم کرتی ہے۔ لیکن آپ یہ بتائیے کہ اگر کوئی شخص مرجانے کے بعد بیان دے تو آپ اُسے سچ مانیں گے یا جھوٹ۔ اس سوال کا جواب دینے میں آپ کو مشکلات کا سامنا ہو یا نہ ہو کرانا کا تبین کو یقیناً ہو گا۔ آپ ہنسیں گے کہ مرنے کے بعد کرانا کا تبین کا کیا سوال لیکن اتنا تو آپ جانتے ہوں گے کہ تحریروں میں "مکرر آنکہ" کی بھی تو کوئی حیثیت ہے!

مرنے کے بعد جو دقتیں پیش آتی ہیں ان میں ریڈیو نے اس ایک دقت کا اور اضافہ کر دیا ہے کہ اپنی یاد میں مبتلا ہو جاؤ اور دوسروں کو ہنسنے کا موقع دو۔ مرنے کے بعد ہنسنے کا موقع دینا کوئی قابل فخر بات نہیں ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو مجھے یا کسی دوسرے کو اپنی حرکات سے باز رکھ سکے۔ جس دنیا کو میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں بہت سے ایسے لوگ تھے۔ اب بھی یقیناً ہوں گے جنھوں نے کبھی کوئی قابل فخر بات نہ کی لیکن ان کی بات اور ذات پر فخر کیا گیا۔

زندگی میں مجھے ہنسانا بہت پسند تھا، مرنے کے بعد رُلانا مجھے بالکل پسند نہیں لیکن اگر رونا کسی کا پیدائشی حق ہو تو میں اس میں مخل بھی نہ ہوں گا، البتہ کوئی بے سمجھے ہنس پڑے تو میں لڑ پڑوں گا۔ اگر فی الفور مر نہ گیا۔ موت کا علم کسی کو نہیں گو موت سب کو آتی ہے۔ یہ میں شروع ہی میں کہہ آیا ہوں۔ لیکن جہاں میں ہوں (ملٹری نہیں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی آجکل

مقام کا اتنا پتا دینا خلاف مصلحت ہے) وہاں افواہ یہ ہے کہ میری موت واقع اس لئے ہوئی کہ ایک کور ذوق بغیر کچھ سمجھے محض احتیاطاً میری بات پر ہنس پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ میں نے بات کہی ہے اس لئے وہ یقیناً کوئی ہنسی کی بات ہوگی! یہ فریقین کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا چنانچہ میں نے ڈوبنے کا انتظار نہ کیا مرگیا — اور کچھ کہہ نہ گیا! ارباب ریڈیو مجھ پر بڑے مہربان رہے ہیں، ان کو گوارا نہ ہوا کہ "مرگیا کچھ کہہ نہ گیا" کا الزام مجھ پر قایم رہے، اُنھوں نے سب سے پہلے مجھے زندگی کے الزام سے بری کر دیا۔ اس کے بعد مجھے موقع دیا کہ میں "بیان استغاثہ" یا "جواب ملزم" کے طور پر آپ کے سامنے کچھ پیش کروں۔ ریڈیو کی عدالت نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہے کہ میرا یہ بیان شامل مسل ہونے کے لئے عدالت العالیہ کو بھیجدیا جائے گا۔

ہنسنے ہنسانے کی علت نے زندگی کے آخر میں مجھے کٹکھنا بنا دیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بڑھاپے میں جب دانت مفارقت کر جاتے ہیں تو کٹکھنے پن سے اس کی تلافی ہوتی رہتی ہے۔ میں مرنے سے پہلے ادھ موا ہو چکا تھا۔ مجھ پر ایسے لوگوں کی ٹھٹول بڑی شاق ہوتی تھی۔ جن کو بات کرنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مجھ سے وہ بات اس طور سے کرتے تھے جیسے اُن سے بڑا خوش مذاق یا خوش مذاقوں کا مربی و محسن کوئی دوسرا نہ تھا۔ دوسری طرف میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی غرض مجھ سے جلد سے جلد بیان کر دیں اور مجھ سے نہ ہو سکے تو بھی اسے جلد سے جلد پورا کر دوں۔ اکثر تو طبیعت ایسی اُکتائی ہے کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اُن کا کام نہ کر سکوں گا تو بھی اس کو پورا کرنے کا جھوٹا حلف اُٹھا لوں گا۔ لیکن وہ برابر مذاقیہ جملے بولتے جاتے تھے اور خود ہی گنواروں کی ہنسی ہنس ہنس کر اپنے آپ کو داد دیتے جاتے۔ "میں چاہتا تھا کہ وہ بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی سے باز آکر مجھے جلد سے جلد گولی مار دیں۔ لیکن وہ "مزاح المزارعین" سے باز نہیں آتے تھے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو وقت وہ مسخرگی کے مظاہرہ میں صرف فرماتے وہی وقت میں اپنے دل کو مضبوط کرنے پر صرف کرتا تھا کہ سب کچھ کروں گا انہی کا کام نہ کروں گا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ مانگتے قرض اور میں کچھ نہ کر پاتا اُن کا سوا اس کے کہ دوسروں سے قرض لیکر ان کے حوالہ کر دوں۔ چونکہ قرض لینے کے بعد وہ میرا یا میں اُن کا سامنا نہ کر سکتے۔ اس لئے کراماً کاتبین اس قرض کا ثواب میرے نامۂ اعمال میں لکھ کر اس کی ایک نقل میرے پاس بھیجدیتے!

میری ایک دوسری دقت یہ ہے کہ میں اپنے فن یا موضوع یا اسلوب کے بارہ میں گفتگو کہاں سے شروع کروں اور کیسے شروع کروں۔ میری زندگی کا بیشتر اور بہترین حصہ پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں صرف ہوا۔ کوئی طالب علم مجھسے پوچھتا کہ اچھا لکھنا کیسے آئے گا میں کہتا اچھے آدمی بنجاؤ اچھا لکھنے لگوگے۔ وہ مجھ پر ہنستا اور طرح طرح کے اقوال پیش کرتا، میں کہتا کہ سیکھنے مجھ سے آئے ہو قول دوسرے کا پیش کرتے ہو، میرے لئے تو میرا ہی قول مستند ہے۔ وہ کہتا موتی پھر موتی ہے غوّاص کوئی ہو۔ میں کہتا غواص اور موتی میں ربط نہیں تو پھر غواص چور ہے یا موتی جھوٹا۔ وہ اس پر جز بز ہوتا تو میں اس پر ہنستا!

میں مسلمان پیدا ہوا۔ نہ میری پیدائش میں میرا کوئی دخل تھا اور نہ مسلمان ہونے میں لیکن زندگی بھر جب مجھے ہر بات میں دخل تھا تو خودکشی بھی کر سکتا تھا اور اسلام سے بھی منحرف ہو سکتا تھا مگر میں نے زندگی اور اسلام دونوں ایک ہی بات سمجھا۔ ظاہر میں بھی باطن میں بھی باطن میں بھی مجھے اسلام کا پابند رہنے میں مرتے دم تک کبھی کوئی

اہتمام نہ کرنا پڑا۔ بری بات کو میں نے ہمیشہ بُرا سمجھا اور بھلا اچھی بات میں اسلام کو معاون پایا میں "مسلمان پیدا نہ ہوا ہوتا" تو بھی شاید مسلمان ہی رہتا یہ اور بات ہے کہ مسلمان نہ کہلاتا۔ میں خدا سے سلوک کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہا۔ بغیر اس خیال کے کہ خود خدا میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا اور بغیر اس بات کو ذہن میں لائے کہ خدا کا تصور مسلمانوں کا کیا ہے یا کسی دوسرے کا کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ رسالتمآب کا درجہ خدا نے کیا مقرر کیا تھا رسالتمآب کا تصور میرے ذہن میں ہمارے ہی جیسے ایک ایسے انسان کا تھا۔ جس سے بڑے اور برگزیدہ انسان کا تصور میرے ذہن میں بھی کبھی نہ آیا۔ میں کیا اور میرا تصور کیا لیکن میرے لئے تو یہ میں سب کچھ ہے!

مجھے اوائل طالب علمی ہی سے زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ فراز کم نشیب زیادہ۔ فارسی بہت کچھ اور عربی تھوڑی بہت گھر پر پڑھکر میں انگریزی اسکول میں داخل ہوا۔ سالہا سال اسکول میں اور چھ سال تک علیگڑھ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا۔ "بورڈنگ لائف" کا ٹھپہ میری بقیہ زندگی پر نمایاں رہا۔ یعنی سپاہی اور قلندر کی زندگی آسودہ حال ہونے کے باوجود جب میں علی گڑھ کی اصطلاح میں کافی "عیاشی" کر سکتا تھا۔ دیوجانس کلبی کی طرح ایک ہی مختصر کمرہ میں پورا مکان اور اپنی ضروریات کا تمام سامان سموئے رکھتا تھا، سونے کا کمرہ، پڑھنے کا کمرہ، مہمان کا کمرہ، ملاقات کا کمرہ، کھانے کا کمرہ، لباس کا کمرہ، غسلخانہ، بساط خانہ غرض ہر گفتنی و ناگفتنی شدنی اور ناشدنی امور کا جائے وقوع جغرافیائی اعتبار سے ایک ہی تھا۔ چنانچہ میں مہمان کی حیثیت سے کہیں جاتا اور میزبان میری پذیرائی اور طعام و قیام میں اہتمام کرتا یا تکلف برتتا تو مجھے بڑی وحشت اور ذہنی تکلیف ---- ہوتی تھی ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں کسی کا مہمان شاید ہی کبھی بنتا تھا اسکول میں کرکٹ، ہاکی فٹ بال کا کیپٹن رہا، واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ مجھے کھیلنے کا شوق لایا۔ لیکن میں آیا بہت ناکسی اور بے کسی کے عالم میں اور وہ زمانہ علی گڑھ اور علی گڑھ والوں کی ایسی تمکنت و جلال کا تھا کہ کرکٹ ہاکی فٹ بال میں میرا کوئی پرسان حال نہ ہوا۔ ناچار میں نے ٹینس سیکھنی شروع کی اور کچی بارک (عثمانیہ) میں چارپائی ٹینس کلب کا خود رو ممبر ہو گیا۔ جال کے بجائے چارپائی کھڑی کر لیجاتی تھی اور کچی بارک کے سامنے ریت سے اٹے ہوئے میدان پر لوٹے سے پانی ڈال کر کورٹ بنا لیا جاتا تھا۔ ممبر ہر وہ شخص ہو سکتا تھا جس کے پاس چارپائی اور سکنڈ ہینڈ گیند ہو۔ آنریری ممبر وہ ہو سکتے تھے جو بیت الخلا (جس کا نام اُس زمانہ میں برر آفس بھی تھا) جاتے اور وہاں سے آتے وقت کورٹ کی مٹی اور روندی ہوئی لائن پر پانی ڈال کر اسے پھر سے نمایاں کر دیتے

فرسٹ ایر میں جونیر اسکالر ہوا۔ سکنڈ ایر سے ٹینس ٹیم میں آگیا۔ تھرڈ ایر میں ڈیوٹی سوسائٹی کے وفد کے ساتھ مشرقی بنگال، چٹاگانگ اور برما کا دورہ کیا بی۔ اے میں علی گڑھ میگزین کا اڈیٹر اور ٹینس کا جنرل سکریٹری ہوا۔ فنفتھ ایر میں یونین کا سکریٹری اور ام۔ اے پاس کرتے ہی ٹینس کا پریسیڈنٹ اور اُردو کا لکچرر ہو گیا۔ میں نے انٹرنس پاس کرتے ہی کلرکی کر لی تھی۔ جب کالج میں چھٹیاں ہوتی تھیں تو کلرکی پر چلا جاتا تھا اور چھٹیاں ختم ہوتیں تو کالج چلا آتا اس طور پر پانچ سال گزارے، مجھے دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کر کے بہت سے مقامات اور عجیب و غریب تر تجربات حاصل ہوئے۔ جو بجائے خود ایک مستقل داستان ہے۔ ایک بار دو مہینے کے اندر اندر ایک طرف سر ریجنالڈ کریڈک گورنر برما سے گورنمنٹ ہاؤس میمیو میں علی گڑھ کے حالات و حوادث بالخصوص علی برادران کی

حمایت میں تیز و تند گفتگو کی دوسری طرف بنارس کی عدالت دیوانی میں فرش پر بیٹھ کر شام تک مسلسل نقل کی ہے اور ہیڈ کلرک اور منصرم کی جھڑکیاں اور چپراسیوں کی بے اعتنائیاں اُٹھائیں۔ تیسری طرف علی گڑھ میں آکر ٹینس کے معرکۃ الآرا میچ اور معرکۃ الآرا تریونین کے الکشن جیتے ہیں! گزشتہ ۲۸-۲۹ سال میں علی گڑھ کا کوئی انقلاب ایسا نہ تھا جس سے میں بحیثیت طالب علم یا ممبر اسٹاف نہ گزرا ہوں — دراصل میں کھلاڑی تھا۔ جواری کبھی نہیں رہا۔ علی گڑھ نے کھیل میں اعتنا نہ کیا تب بھی میں نے کھیل نہ چھوڑا۔ بالآخر اُسے اعتنا کرنا پڑا، میری سیرت، میری زندگی اور میرے مضامین میں کھیل ہی کے اُصول اور عادتیں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ سچے اور پکے کھیل کی "اسپورٹسمین شپ" سے میں نے کبھی انحراف نہیں کیا میں کھیل کا قایل تھا ہار جیت کا بالکل نہیں۔ مجھے کھلاڑی سے اُلفت اور بازاری و جواری سے نفرت رہی!!

میری زندگی کا سب سے وقیع حصہ علی گڑھ میں اور علی گڑھ کے لئے صرف ہوا۔ میں نے یہاں شہرت حاصل کی اور آسودگی پائی۔ علی گڑھ کی فیض بخشیوں نے مجھے دوسرے کے فیض سے بے نیاز کر دیا۔ علی گڑھ میری زندگی میری شخصیت میری تحریر میں جاری و ساری رہا۔ بعض ناقدین نے میرے مضامین پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان میں علی گڑھ کی اتنی بہتات ہے کہ باہر والے ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ مجھے چاہئے کہ ہر مضمون کے ساتھ ایک فرہنگ کا اضافہ کر دیا کروں۔ یہ اعتراض صحیح ہے، مشورہ غلط ہے۔ فرہنگ اضافہ کرنے کا کام میرا نہیں ہے۔ ان کا ہے جو میرے مضامین کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ "قبول خاطر"، و "لطف سخن" کا میرا تصور کچھ اور تھا اور میرے اس نقاد کا کچھ اور، علی گڑھ سے باہر بھی میں ہر حیثیت میں، ہر حیثیت کے لوگوں سے ملا ہوں اور ہر حیثیت کی تقریب میں شرکت کی ہے۔ لیکن بات سمجھنے، بات کرنے اور صحیح و بروقت رائے دینے یا گرفت کرنے کا جو ملکہ میں نے علی گڑھ والوں میں پایا وہ مجھے اور کہیں نظر نہ آیا!

"انداز گل افشانی گفتار" مجھ میں علی گڑھ کے ہی "پیمانہ و صہبا" سے آیا! کسی معقول اجنبی سے ملتا تو بے اختیار و بے محابا سوال کرتا علی گڑھ میں بھی پڑھا ہے اگر وہ کہتا، نہیں، تو افسوس ہوتا کہ کیسی کمی رہ گئی!

میرے مضامین میں "علی گڑھ کی بھرمار" کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ ان تقریروں میں دور ہو گیا ہے جو ریڈیو پر میں نے کی ہیں۔ ریڈیائی تقریروں میں میرے لئے بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ان تقریروں میں میں اپنے اور اپنے فن کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ یوشوا انیس نے بھی کہا ہے کہ خیال خاطر احباب چاہئے۔ کہیں ان آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے لیکن ریڈیو نے خیال خاطر احباب کی خاطر اس درجہ احتیاط اور نزاکت برتی ہے اور ایسی ایسی "ٹھیس بچاؤ" تدبیریں وضع کر دی ہیں کہ طنز و ظرافت کے لئے زمین اور آسمان کی وسعتیں تنگ ہو گئیں اور میرا حال "دست و پا یم بشکستند و کمانم دادند" کا مصداق بن گیا۔ طنز و ظرافت میں لطف اور زور دونوں پیدا ہوتے ہیں لیکن ضرورت سے زیادہ پابندیاں عائد کر دینے سے فن میں کوتاہیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

تقریبی مضمون ہو یا غیر تقریبی اتنی بات ہر شخص کو مان لینا چاہئے کہ فن بجائے خود کوئی خارجی چیز نہیں ہے۔ یہ خود صاحب فن کی زندگی اور کارکردگی کا حاصل بھی ہوتا ہے اور اس کا جزو بھی، یہ وہ عبادت ہے جس کے لئے وہ غیب سے مامور کیا گیا ہے۔ ہر موجود یا ہر شخص کسی نہ کسی وظیفہ، عبادت یا مشن کے ساتھ خلق کیا گیا ہے اور اسی وظیفہ عبادت یا مشن کے مطابق اس میں استعداد و دیعت کی گئی ہے، یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنا مشن یا اپنی عبادت دریافت کرے

اور اُسے پورا کرے۔ اسی عبادت میں اس کی نجات مضمر ہے اگر وہ اپنی نجات چاہتا ہے۔ اسی بنا پر ہنسنا ہنسانا بھی ایک عبادت ہے اور اس عبادت کا اجر اتنا ہی ہے جتنا کسی بڑی سے بڑی عبادت کا ہو سکتا ہے بشرطیکہ یہ عبادت اُسی خلوص انصاف اور استقامت سے کی جائے جس سے دوسری عبادتیں کیجاتی ہیں۔

ظرافت یا طنز ایسی چیزیں نہیں ہیں جو کسی خاص چہار دیواری کے اندر خاص رسوم کے ساتھ کسی خاص پردہت کی نگرانی میں حاصل کیجائیں۔ دوسرے فنون یا انسانی سرگرمیوں کی مانند ان کا سرچشمہ بھی زندگی کی پراسرار اور ناپیدا کنار وسعتیں ہیں۔ کوئی شخص زندگی سے علٰحدہ ہو کر نہ فن حاصل کر سکتا ہے نہ اپنے کو پا سکتا ہے اس لئے ظرافت ہو یا عبادت اسکو زندگی ہی میں ڈھونڈھنا چاہئے زندگی ہی سے اس کی آبیاری کرنا چاہئے اور زندگی ہی کے لئے اس کو کارآمد بنانا چاہئے۔ فن کی پرورش و پرداخت تھوڑی بہت فنی چیزوں سے ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ وہ ہماری ہی زندگی سے اپنی زندگی کو تقویت پہونچائے پروان چڑھائے اور مفید بنائے۔ فن اگر زندگی سے ترقی پاتا ہے تو زندگی ہی کی ترقی اس کا مقصد ہونا چاہئے۔

کسی اور فن سے قطع نظر طنز و ظرافت کے بارہ میں میرا خیال ہے کہ یہ محض کتابیں دیکھنے دوسروں کی نقل کرنے منھ بنانے، بندھے ٹکے فقرے کہنے شور مچانے اور بکواس سے نہیں آتے۔ میرے زمانہ میں بہت سارے مزاح نگار پیدا ہو چکے تھے لیکن ان میں دو چار کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس کی کارگزاری کو امید افزا کیا جا سکتا۔ اُس وقت کے اُردو دانوں کو ہنسنے سے پہلے خدا بننے کا بڑا شوق تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ فن کہاں تک ترقی کر چکا ہے انکو اپنی خامیوں کا بھی احساس نہ تھا ہنس پڑنے کو ہنسا دینا سمجھتے تھے۔ میرے زمانہ تک ظرافت کا معیار قریب قریب "پنچ" کا معیار تھا۔ رعایت لفظی فقرہ بازی شورد شغب، مضحک موضوعات کا انتخاب، تتلانا، ہکلانا غرض وہی تمام باتیں جو پنچ میں زیادہ شوخ اور بھونڈے رنگ و آہنگ میں ملتی ہیں ان کے ہاں نسبتاً کم شوخ اور بھونڈے رنگ و آہنگ میں موجود تھیں۔ ہندوستان کا جو رنگ میرے زمانہ تک ازل سے چلا آتا تھا اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ ممکن ہے ہندوستان کو آزادی جلد ملجائے ظرافت اس میں دیر سے آئے گی

ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے، طنز میں ظرافت کا دخل نہ ہونا چاہئے، میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل فن ہے۔ ظرافت کے لئے خوشدلی اور مرحمت درکار ہوتی ہے، طنز میں جوش، رنج، غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ انسانیت میں دونوں کا کیا مقام ہے۔ زندگی اور زمانہ کی مکروہات سے بیزار و بددل ہونا، طیش میں آجانا اور دوسروں کو شرمندہ یا برافروختہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن ان خرابیوں کو دیکھ کر مسکرا دینا اور دوسروں کو خواہ وہ کتنی ہی مصیبت و مایوسی میں کیوں نہ مبتلا ہوں اس پر آمادہ کر دینا کہ وہ ہنس کھیل کر ان مصائب و مکروہات سے گزر جائیں اور ان کو پاس نہ پھٹکنے دیں معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ایک طنز نگار جو فرائض جتنا جلد پورا کر دیتا ہے ظرافت نگار نہیں کر سکتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اکبر کی ظرافت نے یکہ و تنہا جو کام کیا وہ بہت سے طنز نگاروں سے ملکر بھی نہ ہو سکا۔ اکبر کے ہاں ظرافت کے ساتھ طنز بھی ملتی ہے۔ لیکن اس حد تک طنز کو ظرافت میں ملنا چاہئے۔ مغربیت کے نامحدود عناصر پر سب سے پہلے اور سب سے موثر حملہ اکبر کی ظرافت نے کیا۔ شبلی، ابوالکلام، ظفر علی خاں، محمد علی، عبدالغفار، عبدالماجد وغیرہ کی آتش نوائی و نشتر زنی بعد کی چیزیں تھیں۔ نظر براں ظرافت نگار کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے گزرے۔ مجبور ہو کر

نہیں خوشی فراخدلی حوصلہ اور خلوص کے ساتھ ظرافت کی کوئی کان نہیں ہوتی جہاں یہ جواہرات مدفون ملتے ہوں۔ یہ جواہر پارے ہر مقام پر ہوا اور حرارت کی مانند سرایت کئے ہوئے ملیں گے اس لئے ایک ظریف، اور طنز نگار کے لئے بھی سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اپنے تصورات، روایات اور عقاید پر پورا بھروسہ کرکے آگے بڑھے اور نوع انسان کو جہالت، تعصب اور ظلم سے نجات دلائے۔ ایک ظریف اور طنز نگار کو چاہئے کہ وہ سب سے بڑا کائناتی یا آفاقی انسان بنجائے۔

آپ کو سُنکر غالباً تعجب ہوگا کہ میں نے شاید ہی کوئی مضمون بقول شخصے "خوشی خاطر" لکھا ہو۔ لکھنا اسی وقت شروع کیا جب ایسے لوگوں نے میری زندگی تلخ کردی جن کو میں عزیز رکھتا تھا یا جن سے کسی قیمت پر چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا مضمون لکھ لینے پر سمجھتا تھا کہ میں نے بڑا کام کیا ہے۔ اس مضمون سے زمین و آسمان میں تہلکہ مچ جائے گا۔ شایع ہوجانے پر مجھے محسوس ہوتا کہ مجھ جیسا مہمل نگار شخص شاید ہی کوئی اور ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے شایع شدہ مضامین کو پھر سے شاید ہی کبھی پڑھا ہو۔ اگر کبھی ایسا کرنا پڑتا تو دو چار ہی فقروں کے پڑھنے کے بعد اپنے اوپر لعنت بھیجکر بند کردیتا اور کہتا کہ میں تو اس سے بدرجہا بہتر لکھ سکتا تھا یہ میں نے کیا کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب دوسرا مضمون لکھتا تو پھر اسی یقین کے ساتھ کہ کوئی نہ کوئی تہلکہ ضرور پیدا ہوگا۔ چنانچہ اسی طرح تمام عمر مضامین لکھتا رہا، تہلکات ملتوی ہوتے رہے اور میں عجیب آزاد مرد نہ ہونے کے باوجود "حق مغفرت کرے" ہوگیا۔

مجھے مضامین لکھنے میں بہت اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ اس کا اہتمام کہ کسی طرح مضمون لکھنے کا وقت ٹلتا رہے۔ خواہ مخواہ ارد گرد کی صفائی، جو باتیں اپنی یا دوسروں کی مدتوں سے التوا میں پڑی آرہی تھیں ان کے پورا کرنے میں انہماک، مہمل جزئیات کی تکمیل، لکھنے کا سامان بے ضرورت ٹھیک ٹھاک کرنا، وہ حرکتیں کرنا جو کسی اور وقت کبھی نہ کروں، اپنے اوپر وہ جذبہ طاری کرنا جس کے طاری کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، چھوٹے بڑے سے حق بخشوانا یا لڑائی مول لینا اس طرح کی حرکتوں میں لکھنے کا موقع نکل جاتا تو اپنے اوپر آفریں کرتا کہ اتنے کام ہوتے کون شخص مضمون لکھ سکتا تھا۔ پھر ہرج ہی کیا ہے مضمون نہ لکھا گیا نہ سہی کتنے اور ضروری کام کر ڈالے۔ کچھ دن بعد پھر جبراً قہراً لکھنے بیٹھتا۔ ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا کہ پہلی بار گرد و پیش کی جس طرح چول بٹھائی گئی تھی وہ بگڑ چکی ہے پھر سے درست کرنا چاہئے۔ دل گواہی دیتا کہ یہ حرکت سخت نامعقول ہے۔ مجبور ہوکر بیٹھ جاتا اور لکھنے پر آمادہ ہوتا، ارد گرد کی تمام چیزیں دعوت دینے لگتیں کہ ہم حسب معمول تمہاری توجہ کے محتاج ہیں، لکھنے کی ذمہ داری یہ کچوکے لگاتی کہ میں بڑا ہی بے ایمان اور کام چور ہوں، خوامخواہ کے بہانے تراشتا ہوں غصہ میں آکر پھر خفیف ہوکر اس پر آمادہ ہوجاتا کہ کسی کے دو چار فقرے چوری کرکے لکھ دوں کاش کوئی اچھا سا شعر یاد آجاتا کوئی پھڑکتا ہوا فقرہ قابو میں آجاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ سارے فقرے اور اشعار بے مزہ اور بے محل معلوم ہونے لگتے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا جس کا نہ سر ہوتا نہ پیر، سارا صفحہ ایسا نظر آنے لگتا جیسے ہتھیلی کی ریکھاؤں کا چربہ اُتار رہا تھا۔ دوسرے صفحہ کا بھی یہی حشر ہوتا، یکلخت کوئی نعرہ لگاکر اُٹھ کھڑا ہوتا کہ گولی مارو اس لکھنے پر، آخر بندہ بشر ہوں کب تک سر کھپاؤں۔ مونگ پھلی والا کب سے آواز دے رہا ہے۔ موزے پہنے پہنے پاؤں دم بخت ہوگیا، اب مونگ پھلی کھائی جائے گی اور ننگے پاؤں ٹہلا جائے گا۔

مونگ پھلی کھاتے اور ننگے پاؤں پھرتے دیکھ کر غریب دل بھی صبر کرکے بیٹھ جاتا اتنے میں باغ کی طرف توجہ مایل ہوجاتی اوہو ہو، آج خانساماں نے صاف کپڑے پہن لئے فلاں سوکھا گلاب پنپنے لگا۔ بھنگن نے خوب جھاڑ دی ہے۔ لان کس درجہ

سبز اور ہموار ہے، ذرا اس پر چل کر تو دیکھوں، واہ واہ قالین بھی اس کا جواب نہیں، کیا خوب شعر کہا ہے۔
پھولا جو ڈھاک بن میں! وہ زمانہ یاد آگیا جب میں بچپن میں اسکول جاتے ڈھاک کے جنگل سے گزرتا۔ جنگل سے گزر ہی تھا کہ سارا مضمون مستحضر ہوگیا۔ بھاگ کر اپنی کرسی پر آیا، لکھنا شروع کر دیا، جو باتیں حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی تھیں وہ ذہن میں آبشار کے مانند گرنے لگیں خیالات قلم کی روانی سے آگے بڑھنے لگی۔ اس خیال سے کہ کہیں ان کو بھول نہ جاؤں کاغذ کے حاشیہ پر وقتاً فوقتاً نوٹ کرنے لگا۔ اگر اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا کہ مضمون بند کر کے گھاس کھودنی پڑتی یا کئی دن کے لئے لکھنا ملتوی کرنا پڑتا تو قطعاً کوئی ہرج واقع نہ ہوتا۔ جب بیٹھتا خیالات کی روانی شروع ہوجاتی مضمون مکمل ہوجانے پر اس کے نقل کرنے کا مرحلہ پیش آتا میں نقل کرنے میں اپنے مضامین پر اصلاح دیتا تھا۔ جتنی بار یہ مضمون نقل ہوتا اتنا ہی سجل ہوجاتا اس لئے میں اپنے مضامین صرف انتہائی مجبوری کی بنا پر کسی دوسرے سے نقل کراتا اپنا مصلح و معلم بننے کا ملکہ حاصل کرنا انشا پرداز کے لئے سب سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

میں نے بعض ایسے دوستوں عزیزوں اور بزرگوں کی وفات پر بھی مضامین لکھے ہیں جن سے مجھ کو یا جن کو مجھ سے بڑا شغف تھا۔ ان مضامین کے لکھنے میں کوئی دقت کبھی پیش نہ آئی۔ ان کے لکھنے میں مجھ سے صبر و ضبط کا دامن اکثر چھوٹ گیا ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کی تکلیف سے میں بہت متاثر ہوتا تھا اور ان کی دائمی مفارقت مجھے یکلخت زیر و زبر کر دیتی تھی۔ چنانچہ لکھتے وقت میں محسوس کرتا تھا کہ میں اس عزیز کی حضور میں اپنے جسم و جاں اور ذہن و خیال کی ساری متاع پیش کر رہا ہوں۔ اس حالت میں انشا پردازی کے سارے لوازم میرے دل سے یکسر محو ہوجاتے تھے۔ ان مضامین میں الفاظ و عبارت، لب و لہجہ، انداز و اسالیب نکلتے میرے ہی ذہن و قلم سے تھے۔ لیکن آتے معلوم نہیں کہاں سے تھے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایسے مواقع پر صرف مناسب کلمے اور جذبات برآمد ہوں گے جن کو جوں کا توں پیش کر دینا سب سے اچھا اور برگزیدہ فریضہ ہے اور فن بھی۔

میں نے بچوں کے لئے بھی مضامین لکھے ہیں مجھے بچوں سے بڑی اُلفت تھی لیکن اسی وقت جب تک ان کے بچپن میں آور دنہیں آمد ہوتی تھی۔ مجھے ضرورت سے زیادہ نستعلیق اور تمیز دار بچے زیادہ پسند نہ تھے بچوں کو زیادہ سمجھدار نہ ہونا چاہئے اور نہ خواہ مخواہ ان کو بہت زیادہ صاف ستھرا اور پٹاری کا انگور بنانا چاہئے۔ یہ بات آگے چل کر ان میں عجیب و غریب نفسیاتی اُلجھنیں پیدا کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کو سدھارنے میں آج کل جتنا اہتمام کیا جاتا ہے وہ ضرورت سے زیادہ ہے اور یقیناً اتنا مفید نہیں ہے جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی چوتھائی کوشش اگر بچے کے والدین اور اس کے گھریلو ماحول کے درست کرنے میں کیجائے تو نتیجہ نسبتاً نہایت درجہ امید افزا ہوگا۔ بچہ اپنی عاقبت شاید ہی ساتھ لاتا ہو۔ اکثر و بیشتر اُس کے والدین اپنی عاقبت بچے کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ یہ ایک سانحہ ہے جس پر ہندوستان میں بہت کم غور کیا جاتا ہے۔ جہاں سب سے زیادہ غور کرنا چاہئے۔

میں نے بڑی کثرت سے ہر طرح کے مضامین لکھے اور ترجمے کئے۔ دوسروں کی بیگار بھی کافی ہے۔ اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ایک صاحب کو جو کچھ لکھ کر دیا دوسرے صاحب کی فرمایش پر ان کی طرف سے ان پر نکتہ چینی بھی کرنا پڑی۔ جواب اور جواب الجواب کا یہ سلسلہ مدتوں قایم رہا۔ اس قسم کی حرکتوں سے میں بڑی حد تک اسبات کا

قائل ہوگیا کہ یہ کافر دماغ جو چاہے کر دکھائے۔ خیر کو شر اور شر کو خیر ثابت کر دینا اس کے لئے کوئی مشکل بات نہیں لیکن اس مفسدہ پردازی کا اندازہ عام لوگ بالخصوص معصوم اور پرجوش نوجوان بالکل نہیں کر سکتے اور مارے جاتے ہیں۔

اصلی لطف مجھے بے تکلف اور مخلص دوستوں کو خط لکھنے میں آتا تھا۔ ان خطوط میں مجھے سب کچھ لکھ دینے میں مطلق باک نہ تھا اور یہ خطوط میرے اچھے بُرے خیالات اور جذبات کی سب سے اچھی ترجمانی کرتے ہیں یہاں تک کہ مجھے اکثر اس کا خیال آیا کرتا تھا کہ کہیں یہ منظر عام پر نہ آجائیں۔ چنانچہ ایک بار ایک عزیز دوست کی وفات کی خبر آئی تو میں بہت لمبا اور مشکل سفر کر کے جلد سے جلد پہونچا۔ یہ میرے خطوط بہت سنبھال کر رکھتے تھے۔ میں نے پہونچتے ہی مرحوم کے کاغذات کا جایزہ لیا اور اپنے خطوط کے بنڈل قبضہ میں کر کے آگ کے حوالہ کر دیا۔ خدا کرے میرے اس قسم کے خطوط جن عزیزوں دوستوں کے پاس ہوں وہ میرے جذبات کا احترام کر کے ان کو تلف کر چکے ہوں۔ وہ میرے ان کے درمیان پرائیوٹ گفتگو تھی جس کو مشتہر کرنا اخلاقی جرم ہے۔ میرے نزدیک اصلی اور اچھے خطوط وہی ہوتے ہیں جن کو شایع نہ کیا جا سکے۔ مجھے لکھنے پر جو قدرت حاصل تھی اس کی واقعی خوشی مجھے اسوقت ہوتی تھی جب میں اطمینان سے مخصوص احباب و عزیزوں کو خط لکھنے بیٹھتا یا اُن کو کسی اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلاتی ہوتی۔ اس وقت مجھ پر عجب سرخوشی اور ایک ناقابل بیان ارضی و غیر ارضی کیفیت طاری ہوتی میں محسوس کرتا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ براہ راست مکتوب الیہ کے دل میں اُترا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کا ذہن و دماغ میرے قبضہ میں ہے۔ میں جس طرح چاہوں اسے پلٹ دے سکتا ہوں۔ یہ بات کہنے کی نہیں ہے۔ لیکن سُن لینے میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ میں نے خطوط لکھکر بڑے کام نکالے ہیں۔

خطوط کا اصلی جوہر خلوص اور اعتماد ہے۔ اپنا خلوص اور دوسرے پر اعتماد۔ خطوط میں قابلیت کا اظہار نہ کرنا چاہئے۔ اپنی شرافت اور خیر اندیشی کو پیش کرنا چاہئے۔ بقول روسو علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے خلوص کی کمی علم سے کبھی پوری نہ ہوئی!

اب میں تھوڑی دیر کے لئے آپ سے متفرق باتوں پر گفتگو کروں گا، بقول میر پھر بات نہ ایسی سنئے گا، مجھ سے نہیں بلکہ کسی اور سے! میں نے بہت پڑھا لیکن یہ بالکل نہیں بتا سکتا کہ کیا پڑھا۔ مجھے کسی کتاب کا مضمون یاد نہیں رہا لیکن اس کے تاثرات قایم رہے۔ ایک کتاب کا نصف صفحہ بھی پڑھکر بھول جاتا کہ کیا باتیں لکھی تھیں لیکن یہ محسوس کرتا کہ دماغ کے بعض نامعلوم سوتے کھل گئے ہیں۔ چنانچہ اسی وقت کچھ لکھنے لگتا تو وہ کوئی ایسی بات ہوتی جو پہلے کبھی ذہن میں نہ آئی تھی اور اس کتاب میں بھی نہ تھی جو میں ابھی پڑھی تھی میرے دو ایک ایسے گہرے اور مستند دوست تھے جنکو مدنظر رکھکر میں لکھنا شروع کرتا تھا ہر بات اور ہر فقرہ کو ذہن میں تول کر لکھتا تھا کہ یہ بات میرے دوست تک پہونچی تو وہ داد دے گا یا نہیں۔ اس نے داد دیدی تو پھر مجھے اسکی پروا نہیں ہوتی تھی کہ خلق اللہ نے اُسے پسند کیا یا نہیں۔ چنانچہ اگر زمانہ میں میرے کارنامہ کی دھوم ہو جاتی لیکن دوست مطمئن نہ ہوتا تو میں اپنی نظروں سے گر جاتا تھا اور مجھے دوسروں کی توصیف منہ چڑھاتی معلوم ہوتی۔ میں ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے آدمی سے ملا تھا جو مذہب، سیاست، حکومت شعر و ادب، فلسفہ و حکمت اور اس قسم کی دوسری باتوں میں ممتاز تھا۔ مجھ پر کسی کا اثر نہ ہوا یعنی ملنے کے بعد میں نے اپنے اندر کوئی تغیر محسوس نہیں کیا لوگ اکثر ہوئی

سوا مخلص دوستوں کے جن سے ملنے کے بعد مجھ کو ہمیشہ اپنی موجودہ سطح سے بلند ہونے کا ولولہ پیدا ہوا۔ میں ہر مذہب کا احترام کرتا تھا مگر میں نے مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔ مذہبی آدمی اکثر عقاید کی خانہ پُری کرکے اعمال سے بے فکر ہوجاتے ہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھنا چاہتے کہ خدا نے اپنی نجات انسانوں کے سپرد نہیں کی ہے بلکہ انسانوں کی نجات انسانوں کے سپرد کی ہے۔ خدا نے عقاید و عبادت کو خدمت خلق کے راستہ سے نازل کیا ہے اور اسی راستہ سے وہ ان کو پرکھے گا۔ عقاید اور اعمال کو یہ لوگ علٰحدہ علٰحدہ قانون میں بانٹ دیتے ہیں حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا کا فرمان اور منشا علٰحدہ خانوں میں نہیں بٹتا ہے۔ دنیا کیا چیز ہے۔ زندگی کا کیا مقصد ہے، انسان کیوں پیدا کیا گیا، مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ ان باتوں نے مجھ میں نہ کبھی تجسس پیدا کیا نہ تشویش۔ شرافت، خوشدلی اور بہادری ان سب کا جواب ہے غالباً اسے بھی اسلام ہی کہتے ہیں۔ ہر انسان انسان ہی نہیں خدا بھی ہے اس کو اپنے اوپر دوسروں پر نہیں، خدائی کرنے کے لئے خدا نے بھیجا ہے اس لئے انسان قطعاً مجبور نہیں ہے مختار ہے۔ مختار اس کو نہیں کہتے کہ جو چاہے کر ڈالے۔ مختار وہ ہے جو اپنی اچھی استعدادوں کو پورے طور پر اور آخر تک بر سر کار لا سکے۔ خواہ وہ استعداد معمولی ہو یا غیر معمولی اس کے بعد ہر انجام انعام بن جاتا ہے خواہ وہ المناک ہی کیوں نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ وہ اچھے بُرے میں تمیز کر سکتا ہے۔

میرے زمانہ میں ہندوستانی عورتیں اپنی اصلاح اور اپنے ترفع میں اتنی سرگرم نہ تھیں جتنی اُن سے کچھ قبل انکی پیشرو تھیں۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ وہ دشوار گزار اور اصلی راستہ کو چھوڑ کر ارد گرد کی پگڈنڈیوں پر جا پڑی تھیں۔ جہاں وہ سفر کی صعوبت سے پناہ لے کر جنگلی پھل پھول کے درمیان پک نِک میں مصروف ہوگئیں۔ اور بالآخر پک نِک ہی کو منزلِ مقصود قرار دیدیا۔ جس طرح اقبال نے ایک جگہ بتایا ہے کہ نماز میں سجدہ کرنے کی آزادی ملجانے سے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کو آزادی نصیب ہوگئی ہے اسی طرح یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ عورتوں کو سینما اور ناچ گھر میں جو فروغ نصیب ہوا اور نوجوان شعرا اور ادیبوں نے عورتوں کو جس حیثیت سے نظموں اور افسانوں میں جگہ دی اس سے عورتیں سمجھنے لگیں کہ انھوں نے زندگی کی بازی پوری نہیں تو بڑی حد تک جیت لی۔ جنگ کی ہولناکیوں میں عورت پر جو گزر جاتی ہے اس کا احساس عورت عجیب غلط طور پر کرتی ہے۔ وہ اپنی مانگ بڑھنے کو اپنی ترقی سمجھنے لگتی ہے عورت جھوٹی اور چمکدار چیز کی طرف بہت جلد مایل ہوجاتی ہے۔ میں نے جب دنیا کو خیرباد کہا ہے تو وہ اپنی زندگی کی بتّی کو دونوں سروں سے روشن کئے ہوئے تھے۔ روشنی یقیناً زیادہ ہوگئی تھی لیکن شمع جلد بجھنے والی تھی! میرے زمانہ تک عورت کی مدد کوئی نہیں کرنا چاہتا تھا، حاصل سب کرنا چاہتے تھے۔ افسانوں اور نظموں میں صرف جوان عورت کی پرستش و پذیرائی کیجاتی تھی۔ اُن کی والدہ، چچی، ممانی، دادی، خالہ وغیرہ کو کبھی جگہ بھی دیجاتی تھی تو نوکروں کے ڈبّہ میں!

اُردو لکھنے والوں کی تعداد خاصی ترقی کر چکی تھی۔ ان میں ٹھکانے کے لکھنے والے بالعموم وہی لوگ تھے جو مغربی علوم اور طرز انشا سے واقف تھے۔ مغربی ادب کے مقابلہ میں اُردو ادب کا تذکرہ بے کار ہے غزل کے علاوہ جو بدنام ہونے کے باوجود اُردو شاعری کی آبرو تھی، اُردو ادب کو مغربی ادب سے بہت کچھ نہیں بلکہ سب کچھ سیکھنا باقی تھا ہندوستان والے جتنا چاہیں مغرب پر لعنت بھیج لیں۔ لیکن محض لعنت بھیجنے سے کبھی کام بنا ہے اور نہ بنے گا۔ اگر اُردو لکھنے والے یہ

چاہتے ہیں کہ اچھے اور بڑے مصنفین کے پہلو میں جگہ ملے تو ان کو مستند مغربی مصنفین کا نہایت کثرت سے، نہایت گہری نظر سے اور نہایت خلوص اور فراخدلی سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ کیا لکھنا چاہئے۔ کہاں پہونچ کر لکھنا چاہئے اور کیسے لکھنا چاہئے یہ باتیں مستند مغربی مصنفین کے ہاں ملیں گی۔ لیکن یہاں ایک خطرہ کا بھی اظہار کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ مغربی مصنفین کا مطالعہ ہی کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ خود مطالعہ کرنے والا بھی مخلص اور متدین ہے یا نہیں۔ مغربی تصانیف کو اُردو میں ڈھالنے کا سلیقہ ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ ہم کو جن مغربی مصنفین یا ان کے اسالیب یا موضوع سے روشناس کر رہا ہے۔ وہ دوسرے یا تیسرے درجہ کے مصنفین ہیں۔ وہ ہمارے ملک اور زبان کے مزاج سے واقف ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے معمولی درجہ کے مغربی مصنفین یا تصانیف سے فایدہ اُٹھانے کے درپے ہو۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرے زمانہ میں یہ خرابیاں اُردو میں راہ پا رہی تھیں۔ اُردو کو نقصان پہونچ رہا تھا اور مغربی مصنفین بھی بدنام ہو رہے تھے۔

مجھے اچھے کھانے، اچھا پہننے اور راحت کی زندگی پسند نہ تھی۔ یہ باتیں دراصل عورتوں اور بچوں کو زیب دیتی ہیں۔ میں سب سے کم وقت کھانا کھانے، کپڑا پہن لینے، منہ ہاتھ دھونے حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے یا سفر کے لئے آمادہ ہو جانے میں لیتا تھا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ دل میں خوشی اور خلوص ہو تو رسمی تکلفات بے معنی ہیں۔ مجھے اپنے اوپر وقت، دولت، راحت، اور اس قبیل کی دوسری چیزیں صرف کرنا بڑا شاق ہوتا تھا۔ لیکن مجھے یہ چیزیں بجائے خود ناپسند نہ تھیں البتہ میں اس کے درپے رہتا تھا کہ اپنے بجائے ان کا فایدہ میں دوسروں کو پہونچاؤں میری ایک کمزوری ایسی تھی جس کو میری زندگی میں غالباً کسی نے نہ پہچانا۔ وہ یہ کہ میں ڈرانے دھمکانے سے کبھی قابو میں نہیں آسکتا تھا۔ اگر مجھے کوئی ڈراتا یا دھمکاتا تو نبرد آزمائی کے لئے مجھ میں بعض نہایت نامعقول خصایل بیدار ہونے لگتے تھے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ یعنی میں جس کو دوست سمجھتا یا جس کا مجھ پر احسان ہوتا یا جس کو میں مجبور و مظلوم سمجھتا تھا اس کی حمایت میں خواہ وہ بیجا کیوں نہ ہو عقل اور اخلاق دونوں سے گزر جانے میں مطلق تامل نہ کرتا۔ الکشن وغیرہ میں ووٹ اپنے دوست ہی کو دیتا خواہ فریق مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ نازل ہوا ہو۔

مجھے زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنا رہی جو میرے اطمینان کے مطابق پوری نہ ہوئی، یعنی یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجت مند کی اپنے اطمینان کے مطابق مدد کر سکتا یا میرا کوئی ایسا دولتمند دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آتی تو وہ میری خاطر اور مجھ پر بھروسہ کر کے اسے پورا کر دیتا۔ میں خدا کی ناشکری نہ کروں گا، اس بارہ خاص میں میرے دوستوں ہی نے نہیں بلکہ میری تحریک پر بعض اجنبیوں نے غیر متوقع پر مدد کی لیکن واقعہ یہی ہے کہ میری یہ تمنا اُس حد تک پوری نہ ہوئی جس حد تک میں اسے پوری دیکھنا چاہتا تھا۔ میں خدا سے انھیں ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا کوئی راز ایسا نہیں ہے جس سے وہ لوگ واقف نہ ہوں جن کو اُس راز سے واقف ہونے کا حق حاصل تھا۔ میں دوستی چھپا سکتا تھا۔ دشمنی کبھی نہ چھپا سکا۔ حماقتیں میں نے اکثر کی ہیں سازش کبھی نہ کی۔

علی گڑھ میں رہ کر میری عادت ہو گئی تھی کہ ہر کام خواہ وہ کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اس وقت کیا جائے جب اس کام کا وقت بالکل ہی گزر جانے پر آگیا ہو۔ کام ہمیشہ وقت ہی پر ہو کر رہا لیکن اس کے لئے جس بے تکی و بے پناہ جد و جہد کو بر سر کار لانا پڑتا اُس سے عہدہ برآ ہونے کا احساس بھی بڑے مزے کا ہوتا۔ اس سے مجھ میں وہ اعتماد پھر عود کر آتا جس کو میں کسی نہ کسی وجہ سے کھو چکا ہوتا تھا۔ اس لئے میں اپنے آپ میں نوجوانوں کا حوصلہ اور تب و تاب محسوس کرنے لگتا۔ یہ وہ خود فریبی تھی جس نے مجھے دنیا کے تمام آلام و مصائب کے مقابلہ میں مستعد اور مگن رکھا۔ میں کام اس وقت زیادہ کرتا تھا جب فرصت کم ہو موسم خراب ہو اور طبیعت بھی اچھی نہ ہو۔ ایسے مواقع پر کام میں لگ جانا یوں مفید ہوتا کہ میرا ذہن تکلیف اور نامساعد حالات کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا تھا۔ کام کرنا وہ نشہ ہے جس میں نہایت آسانی سے ہر قسم کے مصائب غرق کئے جا سکتے ہیں۔ جب موسم خوشگوار ہوتا اور طبیعت بحال ہوتی تو مجھے کام کرنا مطلق پسند نہ تھا۔ میری لغت میں تعطیل منانے کے یہ معنی تھے کہ کسی کو مزے کا خط لکھا جائے گھر سے باہر قدم نہ نکالا جائے۔ باغ میں کام کیا جائے، گھر کی صفائی کی جائے، ایک آدھ وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے یا دو چار وقت کا کھا لیا جائے۔ بیوی بچوں کو بھی کوئی کام نہ کرنے دیا جائے۔ جو ملنے آئے اُس سے طرح طرح سے بچا جائے غسل کرنے کا اہتمام کیا جائے اور صرف ہاتھ پاؤں کو جھاڑ پونچھ لینے پر اکتفا کیجائے۔ بڑا قرض لے کر چھوٹے چھوٹے قرض ادا کئے جائیں اور جو رقم بچ رہے اُسے لے کر بازار چلا جائے اور بے ضرورت چیزیں خرید لائے۔ مجھے قرض لینے اور اس کے ادا کرنے کی بیحد خوشی ہوتی تھی۔ میں قرض کو فنونِ لطیفہ میں سے سمجھتا تھا۔ کب لیا جائے کس سے لیا جائے کس طرح لیا جائے۔ اس سے دوستی بڑھائی اور دشمنی گھٹائی کس طرح جا سکتی ہے — میرے ایک دوست تھے جو اکثر بے وجہ مجھ سے خفا یا اپنی بیوی کی طرف سے منحرف ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی میں ان کو ایسی حالت میں پاتا فوراً کسی بہانہ سے قرض مانگ بیٹھتا اور وہ یکلخت چونک اور چونچال ہو جاتے تھے۔

زیادہ سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بدتوفیقی تھا۔ یہ باتیں صرف مریضوں اور لیڈروں کے لئے روا رکھی جا سکتی تھیں۔ دنیا اور اس کے کاروبار اتنے دلچسپ تھے اور ہر آن انسان کو بہتر و برتر بنانے میں اس درجہ معاون ہوتے تھے کہ میں سونے میں ان کو کھونا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ سونا محض سونے کی خاطر میرے نزدیک فعلِ عبث تھا۔ دنیا دیکھنے اور برتنے کا جو لطف اور ذمہ داری ہے اس کو آدمی سمجھ لے تو میرا خیال ہے کہ وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی سونے پر آمادہ نہ ہوگا۔ سیاسی سرگرمیوں کی خاطر نہ مجھے جیل خانہ پسند تھا نہ جاہ و منزلت۔ میں اُس آدمی سے بہت خوش رہتا تھا جو مجھ سے کم سے کم ملتا اور زیادہ سے زیادہ مجھ سے کام لیتا۔ مجھے دربار داری سے سخت نفرت تھی دربار داری کے محتاج وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لئے وہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ اپنا نفس لعنت بھیجتا ہے تو وہ کرایہ کے قصیدہ خوان اپنے ارد گرد رکھتے ہیں طوائف سے ہمدردی بھی کی جا سکتی ہے دربار دار پر صرف لعنت بھیجی جا سکتی ہے۔

میرے زمانہ میں سینما کو بڑی ترقی اور اہمیت حاصل تھی۔ سب سے کم سینما دیکھنے والوں میں میرا بھی شمار تھا میں تصویریں دیکھنا گناہ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن مجھے اچھا مضمون لکھنا اور بیوی بچوں یا دوستوں اور دشمنوں میں بیٹھ کر

نئی تصویریں بنانا زیادہ پسند تھا۔ ممکن ہے میں نے اچھے ہندوستانی فلم نہ دیکھے ہوں اسی سبب سے میری رائے یہ ہو کہ قدیم ہندوستانی تھیٹر اور موجودہ ہندوستانی فلم میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے دونوں کے اداکار تو لنج یا ہسٹیریا میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ وہ اداکاری اور حرکات میمونی میں بہت کم فرق کر سکتے تھے۔ میں نے سینما کے اداکاروں کو دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہے تھے لیکن رونے کے دوران میں گاتے اس اہتمام و مشاقی سے تھے کہ تال و سم میں ذرہ برابر فرق نہ آنے پاتا تھا۔ یہ کیونکر ممکن تھا۔ سینما کمپنیاں روپیہ کمانے کے فن میں طاق تھیں۔ وہ فن کے رموز سے بے بہرہ اور زندگی کے آداب سے لاعلم تھیں۔ ان کے ہاں زندگی عبارت تھی صرف حسن اور عشق سے۔ عورتوں کا حسن اور عورتوں سے عشق! حسن اور عشق کا یہی تصور اور اتنا ہی سا تصور غالباً جانوروں کا بھی ہوتا ہے۔ مجھے سینما سے اتنی دلچسپی ضرور تھی کہ جو باتیں مجھے دنیا کے پردہ پر نظر نہ آتی تھیں، وہ مجھ کو سینما کے پردہ پر نظر آجاتی تھیں۔

عورتوں کے بارے میں میری کچھ ہی رائے کیوں نہ ہو میں جنسی میلانات کو بڑی اچھی چیز سمجھتا تھا اور جو ایسا نہیں سمجھتا تھا اس کو میں کسی جنس میں نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن میں جنسی میلانات کو بدوضعی کا بہانہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ان میلانات کی موجودگی مستحسن ہے اس کا مظاہرہ مذموم ہے۔ ہر انسانی فعل کا محرک جنسی میلان ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک جنسی میلان کا ارتکاب نہ کر لیا جائے اسوقت تک کوئی کام شروع نہ کیا جائے اور کوئی کام کام نہیں جب تک اس پر جنسی میلانات کی منبت کاری نہ ملے۔ ہر بات خدا سے منسوب کیجاتی ہے۔ لیکن محض اسی بنا پر کسی عدالت یا مولوی نے ملزم یا مجرم کو معاف نہیں کیا ہے۔ میلان اور اعلان ہم قافیہ ہوں تو ہوں ہم معنی تو نہیں ہیں!

مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے بڑی بے اطمینانی تھی۔ ان میں مقتدی سے زیادہ امام پیدا ہونے لگے تھے وہ نماز کے اتنے قایل نہیں رہے تھے جتنے جانماز کے۔ وہ بیماری کو علاج صبر و پرہیز سے دور کرنے کے بجائے بیماری کو پروپیگنڈا بنانا زیادہ مفید سمجھنے لگے تھے۔ وہ جنگ کے لئے کیل کانٹے سے تیار ہونے کے بجائے دشمن کو اُکسانے پر زیادہ مایل تھے میں جب دنیا سے گزرا ہوں تو میرے ذہن میں یہ اندیشہ بھی جاگزیں تھا کہ مسلمان دشمن کو شاید ہزیمت دیدیں لیکن مال غنیمت سے ہزیمت یقیناً کھا جائیں گے۔

میرے زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے سے سخت بیزار تھے۔ دونوں اس کے درپے تھے کہ کس طرح اور کتنے عناصر ایسے دریافت کئے جا سکتے تھے جو دونوں کو ایک دوسرے سے بیزار رکھنے میں معین ہو سکتے تھے یہ فکر کسی کو نہ تھی کہ ایسی باتیں بھی دریافت کرنی چاہئیں جن پر تھوڑا بہت اتفاق ہو سکتا ہو۔ ہندو مسلمان دونوں اپنے اپنے قومی مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دینے میں بدحواس تھے۔ وہ اپنے سے اور ایک دوسرے سے اس درجہ بدگمان تھے کہ وہ قومی مفاد اور ملکی مفاد کو امتزاج نہ دے سکتے تھے اور نہ امتزاج دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہ کر سکتے تھے تو اچھے ہمسایہ کس طرح بن سکیں گے۔ ناخداؤں میں جنگ چھڑ چکی تھی، مسافر سراسیمہ تھے اور طوفان کا سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ وہ تعطل دور نہ کر سکتے تھے۔ تہلکہ بھی دور نہ تھا!

'خیال' اور 'الفاظ' میں کس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اچھا خاصا دلچسپ اور دقیق مسئلہ ہے۔ لیکن لکھنے کے دوران میں مجھے اس کی دقت محسوس نہ ہوئی، عام طور پر یہ بات مان لی گئی ہے کہ آدمی سوچتا الفاظ ہی میں ہے اور

سوچنے اور بات کے متعین کرنے میں الفاظ بڑے معاون ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر میں نے ایسا بھی محسوس کیا ہے جیسے دل میں ایک بات بغیر الفاظ کے بھی آئی۔ اسے ذہنی کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ یہ کیفیت یا اثر "معنی بے لفظ" ہے۔ اس کو مختلف طور سے ظاہر کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کو بے کم و کاست بیان کر دینا ناممکن ہے۔ جس کو "مکمل اظہار" کہتے ہیں میرے نزدیک وہ ناممکن الوقوع ہے یہی سبب ہے کہ اظہار کیف و خیال میں آرٹسٹ کو بڑی کاوش کرنا پڑتی ہے۔ اسی کاوش میں جس حد تک کامیابی ہوتی ہے اُسی حد تک اور اسی معیار سے آرٹسٹ کے کمال یا فن کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ خیال یا کیفیت اظہار کے لئے الفاظ، آواز، حرکت رنگ وغیرہ کے سانچے بنے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے ان سانچوں کا آرٹسٹ کے ہاں کیا درجہ ہوگا۔ سانچوں کا صحیح انتخاب ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے سے بڑے فن کار کے بس میں بھی پورے طور پر نہیں آتے۔ اس لئے کہ یہ سانچے یا وسایل محدود ہیں۔ اور واردات ذہنی لامحدود۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ اور باتوں سے قطع نظر، شاعر تشبیہ و استعارات اختراع کرتا رہتا ہے۔ الفاظ بھی تو ایک طور پر تشبیہ و استعارہ ہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن الفاظ کا درجہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ خیال یا جذبہ حسین بھی ہو سکتا ہے اور قبیح بھی لیکن شاعر ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے کہ حسین قبیح اور قبیح حسین نظر آنے لگے یا حسین حسین تر اور قبیح قبیح تر بن جائے۔ الفاظ کے استعمال میں اگر احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو دنیا کا شور و فتن بڑی حد تک اعتدال پر لایا جا سکتا ہے، خیال کی آمد میں الفاظ کی آورد اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ہے! نئے ادب کے پیروؤں پر یہ الزام ہے کہ وہ جذبات کو بے لگام نہ ہونے دیں۔ اس اُصول پر عمل کرنے سے "بہتوں کا بھلا ہوگا"۔۔۔ "بہتوں میں" بعض مولویوں اور لیڈروں کو بھی شامل کر لیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا!

لکھنے میں ظاہر ہے ارادہ کو بھی دخل ہوتا ہے اور میں خود بھی ارادہ کرتا تھا۔ لیکن در اصل میرے لکھنے میں میرے ارادہ کو اتنا نہیں جتنا ایک خاص لمحہ کو دخل ہوتا تھا۔ یہ میں کبھی نہ دریافت کر سکا کہ وہ لمحہ کب اور کیسے میسر آ سکتا تھا میں لکھنے میں ابتدا ارتقا اور عروج وغیرہ قسم کی بات ملحوظ نہیں رکھتا تھا۔ مخلصانہ اور بے تکلف گفتگو میں ان اُمور کی پابندی نہیں کی جا سکتی اور نہ کرنا چاہئے مجھے مضمون نگاری کے متداول آداب تسلیمات بھی نہ آتے تھے۔ میں قارئین کو اپنا اچھا اور بے تکلف دوست سمجھ کر گفتگو کرنا شروع کرتا تھا۔ اچھا اور بے تکلف دوست ہی نہیں بلکہ اچھا اور بے تکلف خاندان بھی جس میں جوان، بوڑھے، بیمار، تندرست، ملول سرور بھی ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس حلقہ میں ایک اچھے رفیق کی حیثیت سے پیش کرتا تھا۔ اچھی گفتگو کسی پروگرام کے ماتحت نہیں ہوا کرتی کہ صرف یہ ہوگا اور یوں ہوگا۔

گفتگو کرنا ایک سفر کے مانند ہے جس میں مختلف مناظر مختلف اشخاص اور مختلف حالات و حوادث سے سابقہ ہوتا ہے ایک اچھا آدمی ہمسفروں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور ان کے رنج و راحت پر ترجیح دیتا ہے یہ شرافت ہی کی نہیں اچھے لکھنے والے کی بھی پہچان ہے۔ لکھنے میں اور گفتگو کرنے میں بھی، رونا، گڑگڑانا، رعب بٹھانا اور قابلیت جتانا نااہلوں کا کام ہے۔ میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے تھے مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔ ان مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق تھیں۔ میں خود نہیں بہکتا تھا دوسروں کو

بہکنے کی فرصت دیتا تھا۔ عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جا سکتی ہیں نہ سنائی جا سکتی ہیں۔

نئے اور پرانے کی آویزش ازل سے چلی آتی ہے لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جب میں نے سفر آخرت کیا ہے اُسوقت بوڑھوں اور نوجوانوں میں اختلافات کی جو خلیج حایل ہوگئی تھی وہ ناقابل عبور حد تک عمیق اور وسیع ہوگئی تھی جس کی مثال شاید ہی تاریخ میں ملتی ہو۔ نوجوانوں کا یہ سمجھنا کہ وہ کبھی بوڑھے نہ ہوں گے سمجھ میں آنے کی بات تھی البتہ یہ بات تعجب اور افسوس کی تھی کہ بوڑھے اپنی جوانی بھول چکے تھے۔ ان کو جوانوں سے چڑھ ہوگئی تھی۔ یہ بھوڑھوں کی بھول تھی۔ بوڑھوں کا سابقہ دو عالمگیر جنگوں سے ہو چکا تھا لیکن وہ ان انقلابات کے مطالبات اور مطائبات دونوں سے ناآشنا تھے۔ نوجوانوں سے مجھے ہمدردی تھی۔ وہ ایک جنگ کی پیداوار تھے اور دوسری جنگ کی گھپت میں تھے۔ وہ زمانہ اور زندگی کی اُلجھنوں میں مبتلا ہوگئے تھے۔ وہ جنگ سے زیادہ اہم اور سنگین حادثہ یعنی صلح کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ جو بات سوچ سکتے تھے وہ یہ کہ نوجوانوں کے لئے ایک نئی دنیا بنائی جائے خواہ وہ انسانوں کے موافق آئے یا نہ آئے۔ وہ اپنی نجات بغاوت میں دیکھتے تھے، انسانیت کی معراج شہادت میں ان کو نظر آتی تھی۔ ممکن ہے وہ ایک نئی دنیا پیدا کر سکتے۔ صحیح اور سچی قدروں کا احترام ان کے دلوں سے اُٹھ چکا تھا اس صورت حال کے پیدا کرنے میں بوڑھوں کا یقیناً دخل تھا۔ بوڑھوں نے کُشتے کا سہارا پکڑا تھا۔ نوجوان شراب میں غم غلط کر رہے تھے۔

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی (ام-اے)

نگار کے پُرانے پرچے

(سنہ ۲۶ء) جنوری عہ ر — (سنہ ۲۷ء) اگست عہ ر — (سنہ ۳۰ء) مئی عہ ر — (سنہ ۳۱ء) جنوری فراست التحریر - عہ ر، جولائی ۴ ر - اگست ۲ ر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۴ ر فی پرچہ — (سنہ ۳۲ء) جنوری غالب نمبر = عا ر فروری ۸ ر، مارچ عہ ر، مئی، جون، جولائی ۴ ر فی پرچہ - ستمبر ۴ ر، نومبر ۸ ر — (سنہ ۳۳ء) فروری ۸ ر — (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، اکتوبر ۱۲ ر فی پرچہ — (سنہ ۳۷ء) فروری ۸ ر، مارچ ۶ ر، اپریل ۶ ر، مئی ۸ ر، جون ۴ ر، جولائی ۸ ر، اگست ۱۲ ر — (سنہ ۳۸ء) فروری ۶ ر، اپریل ۸ ر، مئی تا دسمبر ۸ ر فی کاپی — (سنہ ۳۹ء) فروری تا نومبر ۴ ر فی کاپی، اگست ندارد — (سنہ ۴۰ء) فروری ۴ ر، مارچ ۴ ر، اپریل ۴ ر، جون عہ ر، اگست ۴ ر، ستمبر ۴ ر، نومبر ۴ ر دسمبر ۴ ر — (سنہ ۴۱ء) مارچ ۴ ر، اپریل ۴ ر، مئی ۸ ر - جون تا دسمبر ۴ ر فی کاپی — (سنہ ۴۲ء) مارچ، اپریل مئی ۴ ر فی کاپی - اگست ۶ ر، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۴ ر فی کاپی، دسمبر ۱۲ ر — (سنہ ۴۳ء) مارچ ۸ ر مئی ۶ ر، جون، جولائی اگست ۱۲ ر فی کاپی - ستمبر، اکتوبر، نومبر ۸ ر فی کاپی دسمبر ۱۲ ر -

منیجر نگار

مالہ وما علیہ

اپریل ۴۲ء کے رسالۂ ادیب میں جناب جگر مرادآبادی کی ایک غزل شایع ہوئی ہے، ملاحظہ ہو:

شعر و نغمہ رنگِ نکہت جام و صہبا ہوگیا — زندگی سے حُسن نکلا حُسن رسوا ہوگیا
اور بھی، آج اور بھی ہر زخم گہرا ہوگیا — بس کرے اے چشمِ بیجاں کام اپنا ہوگیا
اپنی اپنی وسعتیں فکر و یقیں کی بات ہے — جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اسکا ہوگیا
میں نے جس بُت پر نظر ڈالی جنونِ شوق میں — دیکھتا کیا ہوں وہ تیرا ہی سراپا ہوگیا
اُٹھ سکا ہم سے نہ بارِ التفاتِ ناز بھی — مرحبا وہ جس کو تیرا غم گوارا ہوگیا
ہم نے سینہ سے لگایا دل نہ اپنا ہوسکا — دل کی جانب تم نے دیکھا دل تمھارا ہوگیا
وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گزرے بے نقاب — دیر تک ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہوگیا
شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے جگر — قیس دیوانہ تھا محوِ روئے لیلیٰ ہوگیا

مطلع کے پہلے مصرعہ میں "رنگِ نکہت" لکھا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتابت کی غلطی ہے، غالباً "رنگ و نکہت" ہوگا۔ مطلع پڑھنے کے بعد یہ سمجھنا مشکل ہے کہ شاعر کس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہئے کہ مصرعۂ اول میں "ہوگیا" کا فاعل کیا ہے۔ اگر "شعر و نغمہ" کو فاعل مانیں تو اس مصرعہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس چیز کو دُنیا رنگ و نکہت اور جام و صہبا کہتی ہے وہ دراصل شعر و نغمہ ہے، لیکن اگر ہوگیا کا فاعل حُسن ہی کو مانیں جو محذوف ہے تو مفہوم یہ ہوگا کہ شعر و نغمہ، رنگ و نکہت اور جام و صہبا دراصل حُسن ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن ان میں سے جو مفہوم بھی لیا جائے، دوسرا مصرعہ بے تعلق رہتا ہے۔

دوسرے مصرعہ میں دو باتیں ظاہر کی گئی ہیں۔ زندگی سے حُسن کا نکلنا اور حُسن کا رسوا ہونا۔ اس لئے ہم کو ڈھونڈھنا پڑے گا کہ پہلے مصرعہ میں زندگی اور حُسن کی جدا جدا تعیین کن الفاظ سے ہوسکتی ہے، اور حُسن کے نکلنے اور رسوا ہونے کا مفہوم کیونکر پیدا ہوتا ہے۔

پہلے مصرعہ میں اگر شعر و نغمہ کو ہوگیا کا فاعل قرار دیا جائے، تو شعر و نغمہ کو زندگی قرار دیا جائے گا اور رنگت و نکہت اور جام و صہبا گویا اس کی رسوائی کی صورت ہوگی، پھر جام و صہبا میں تو رسوائی کی صورت ہے، لیکن رنگ و نکہت میں کوئی رسوائی کی بات نہیں۔ کیونکہ رسوا ہونے کا مفہوم ہے "عیب فاش ہوجانا" "ذلیل و خوار ہونا" اور اس مفہوم سے

ہٹ کر کسی دوسرے مفہوم میں اس کا استعمال کبھی نہیں ہوتا - بہرحال شعر نہایت اُلجھا ہوا ہے اور شاعر کے مفہوم کو ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں اور بھی، محض وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ بیان میں قوت و زور پیدا کرنے کے لئے اور بھی مکرر لایا گیا ہے تو آج کا لفظ بے محل ہے، اس کی جگہ ہاں ہونا چاہئے۔ علاوہ اس کے شعر کے مفہوم میں بھی کوئی خاص بات نہیں، بہت فرسودہ و پامال خیال ہے۔

تیسرا شعر بھی بیان کے لحاظ سے ناقص ہے۔ پہلے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کی وسعت یا سمائی اس کے فکر و یقین کے لحاظ سے ہوتی ہے، اور اس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص کی وسعت یکساں نہیں ہوتی، فکر و یقین کے لحاظ سے اس میں کمی زیادتی ہو سکتی ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں برخلاف اس کے کہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ "جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا" اور اس طرح گویا یہ وسعت ہر شخص میں تسلیم کی جاتی ہے۔
علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں لفظ وُہ کا مرجع عالم بھی ہو سکتا ہے اور جس نے کا مرجع، معلوم نہیں جگر صاحب نے کس کو قرار دیکر یہ مصرعہ کہا ہے۔ بہرحال یہ مصرعہ بدل دینے کے قابل ہے اور پہلے مصرعہ کے مفہوم کے لحاظ سے اسکو یوں ہونا چاہئے :- میں نے جو عالم بنا ڈالا وہ میرا ہو گیا

چوتھا شعر غالباً عارفانہ رنگ کا ہے، لیکن نہایت ہی معمولی اور پامال قسم کا۔

پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں مرحبا بالکل غلط استعمال کیا گیا ہے۔ مرحبا کے معنے فراخی دکشادگی کے ہیں اور یہ ہمیشہ مصدری مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، اور کسی کی صفت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کوئی شخص خود مرحبا یا آفریں نہیں ہو سکتا۔ "مرحبا اُس پر" لکھنا چاہئے تھا نہ کہ مرحبا وہ - اس قسم کی کم علمی ظاہر کرنے والی غلطیاں، جگر کے اُستاد اصغر مرحوم کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔

چھٹا شعر بالکل طفلانہ ہے اور جگر ایسے کہنہ مشق کے لئے باعث ننگ۔

ساتویں شعر کی ردیف غلط ہے، دیر تک کہنے کے بعد بجائے ہو گیا کے "رہا" ہونا چاہئے۔ ہاں اگر دیر تک کا ٹکڑا نکال دیا جائے، تو بیشک ردیف درست ہو سکتی ہے۔
مقطع میں معنی و بیان کا نقص ہے۔ کیونکہ جب تک یہ ثابت کیا جائے کہ قیس نے لیلیٰ میں حسن حقیقت کا جلوہ دیکھکر اس سے محبت کی تھی، اس پر دیوانگی کا اعتراض نہیں۔ علاوہ اس کے جب "شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے" تو کیا روئے لیلیٰ "شش جہت" سے باہر کی کوئی چیز ہے جو حسن حقیقت سے معرا ہوتی۔

سانپ

(نفسیاتی مطالعہ)

"غلیظ اور گندہ!" میں نے حقارت سے گھونسلے کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں کہا جس کمرہ میں ریڈیو رکھا ہو اور دیواروں پر ڈسٹمپر کیا ہوا ہو اس میں چڑیوں کا غلیظ اور گندہ گھونسلا کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے! میری نظر ہر صبح اس روشندان کی طرف اُٹھ جاتی جس میں ان چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا تھا اور دیکھتا کہ ریڈیو کی میز کے پاس ہی تنکے، بیٹ اور ٹوٹے ہوئے پر پڑے ہیں۔ میں صاف کرتا مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی خس و خاشاک دیکھ کر مجھے غصہ آجاتا جب میں کمرہ میں آتا تو چڑیاں اپنا اپنا منھ نکال کر چیں چیں کرتیں، گویا وہ کہہ رہی ہیں کہ: "تمھاری ساری کوشش کمرہ صاف رکھنے کی بیکار ہے۔ تم روز صاف کروگے اور ہم روز اسی طرح گندہ کرتے رہیں گے!! — میں اپنا ہاتھ انکی طرف اُٹھا کر جھٹک دیتا اور وہ سہم کر گھونسلے سے اُڑ کر دوسرے کمرہ کے کواڑوں پر بیٹھ جاتیں اور دیر تک چیں چیں کرتی رہتیں!! مجھے ان کی چیں چیں ایسی ہی ناگوار گزرتی جیسا ایک بچہ کا رونا تصور کرنے پر بھی! — ایک تو کمرہ کو گندہ کریں اور دوسرے جب ان کو اُڑا دیا جائے تو چیں چیں!! — میں نے دوبارہ ہاتھ کو جھٹک کر شی شی کی اور دونوں چڑیاں کواڑوں سے اُڑ کر صحن کی دیوار پر بیٹھ گئیں اور پھر وہی چیں چیں! — میں تنگ آگیا۔ کسمکھڑی ہوئی تماشہ دیکھ رہی تھی اور مذاقاً مسکرا رہی تھی — میں کمرہ میں واپس آگیا! گھونسلا خالی تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر گھونسلے کو دیکھنے لگا۔ اس کا کچھ حصہ کمرہ کے اندر لٹک آیا تھا۔ اس میں چند سفید و کالے پر تھے، کچھ تنکے اور کچھ دھاگے!

میں خیال کرنے لگا انسان کتنی محنت سے اپنے رہنے کے لئے مکان بناتا ہے۔ اس کی تعمیر کے لئے اس کو ہزار ہا روپیہ چاہئے اور ہزار ہا روپیہ جمع کرنے کے لئے اتنے سال کہ شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکے!! مگر پرند کی عمارت تنکے۔ پر۔ روئی اور دھاگوں کی بنی ہوئی تھی! وہ گھونسلا ظاہر کر رہا تھا کہ انسان کی خواہش اور پرند کی خواہش میں کتنا فرق ہے۔ ایک پرند کی ادنیٰ سی خواہش صرف رہنے کی! اور اسی کے مطابق اس کے رہنے کا گھونسلا ادنیٰ سا!! مگر انسان کی تمنا میں ساری دنیا سما جاتی ہے! اور وہ اپنے رہنے کی جگہ بہت وسیع چاہتا ہے اور اس پر بھی وہ قناعت نہیں کرتا اور اس وجہ سے ایک خوفناک جنگ کے بعد دوسری اس سے بھی زیادہ خوفناک جنگ ہوتی رہتی ہے۔ انسان کو ہم درندہ اس لئے نہیں کہتے کہ وہ درندوں کی طرح کسی کا شکار نہیں کرتا مگر انسان سب سے بڑا درندہ ہے۔ وہ اپنے سے کمزور کو کچلنے میں کبھی نہیں جھجکتا۔ انسان انسان کو گولی مارتا ہے اور مار رہا ہے! کیا موجودہ جنگ میں انسان انسان سے ہی لڑ رہا ہے! ہم تہذیب کی سیڑھیاں یکے بعد دیگرے چڑھتے چلے جا رہے ہیں مگر انسان کی درندگی۔ ویسی ہی باقی ہے۔ گھونسلے پر میری نظر گڑی جا رہی تھی۔ میرے گھر کے مقابلہ میں یہ گھونسلا کتنا ادنیٰ تھا!!

میں نے گھونسلے کو اپنی اُنگلیوں سے چھوا۔ دو ایک پر جھڑ کر نیچے گر گئے اور غلاظت میری اُنگلیوں سے

لس کر رہ گئی - مجھے کراہت آنے لگی - میں اس گھونسلے کے اندر جھانکنا چاہ رہا تھا اس لئے میں میز پر کرسی رکھ کر چڑھ گیا اور دیکھنے لگا - میری ناک سڑ گئی - اُف اتنی گندگی !! — میں نے اپنا منہ پھیرا ہی تھا کہ میں نے دیکھا وہ چڑیاں صحن سے اُڑ کر کمرہ کے کواڑوں پر آکر بیٹھ گئی تھیں اور انتظار کر رہی تھیں کہ جب میں گھونسلے سے ہٹوں تو وہ اندر آویں - میں اپنے آپ کو ایک سانپ خیال کر رہا تھا جو رینگتا ہوا چڑیوں کے بچوں کو کھانے آوے اور چڑیاں دور سے ہی دیکھتی رہیں — میں کرسی پر واپس آکر بیٹھ گیا -

اس دن سارے مکان میں سفیدی ہونے والی تھی - کمرہ کے کونہ کونہ کو صاف کیا جا رہا تھا اور میں اس کشمکش میں پڑا ہوا تھا کہ اس گھونسلے کو بھی یہاں سے نوچ کر باہر پھینک دیا جائے - روزانہ کی آفت تو جائے اور گندگی تو دور ہو - میرا ہاتھ حرکت کرتا تو چڑیوں کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتیں اور میرا ہاتھ رک جاتا - مگر وہ گھونسلا ! - میری ناک میں اس کی بدبو بھر چکی تھی ! - وہ گھونسلا — غلیظ اور گندا - اسی طرح سے لٹک رہا تھا - ہوا کے جھونکے سے چڑیوں کا پر ابھی ریڈیو پر گرا تھا اور کچھ سوکھے ہوئے گھاس کے تنکے اور بیٹ میرے بستر پر !! مجھے پھر کراہت آنے لگی - میں کرسی پر چڑھا اور میں نے اس گھونسلے کو روشندان میں سے نکال کر سڑک پر پھینک دیا روشندان سے گھونسلا ہٹا تو اور زیادہ روشنی ہوگئی اور چڑیوں کی آنکھیں جیسے چکا چوند ہوگئی ہوں - چڑیوں نے کئی بار اپنی آنکھیں جھپکائیں اور پھر پھدک کر اس روشنداں میں بیٹھ گئیں — پھر وہی چیں ! چیں !! میں نے ان کو روشندان میں سے بھی اُڑا دیا - میں کچھ دیر کھڑا ہو کر اس گھونسلے کو کھڑکی میں سے دیکھتا رہا — میں خیال کر رہا تھا — انسان نے اپنی خواہش حاصل کرنے کے لئے دوسرے ملکوں پر حملہ کیا اور وہاں کے رہنے والوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا - انسان نے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے لئے سرمایہ داری کو جاری کیا جس سے لاکھوں غریب آدمیوں کو غلام بنا بنا کر اپنے کارخانے کھڑے کر لئے ! میں نے صرف گندگی دور کرنے لئے اس گھونسلے کو پھینکدیا - یہ ظلم نہیں تھا - اگر ہے بھی تو یہ ان ظلموں کے مقابلہ میں جو کہ اس وقت دنیا میں ہو رہے ہیں کچھ بھی نہیں ہے !

چڑیاں اب بھی میری طرف اپنی آنکھیں رہی تھیں - "ہش" میں نے ان کو پھر وہاں سے اُڑا دیا اور سائکل لے کر باہر نکلا ہی تھا کہ ایک بچہ نے بغیر کچھ بولے میرے سامنے ہاتھ پھیلا دیا - "ہش" میں نے اس سے بھی کہا اور سائیکل پر سوار ہو کر چلدیا !!

مگر میں اپنے ہاتھ دھونا بھول گیا - میں نے اُنگلیوں سے اس گھونسلے کو چھوا تھا جن سے چڑیوں کی سفید بیٹ بھی لس گئی تھی - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنگلیاں ابھی تک سنی ہوئی ہیں اور گھونسلے کی بو اُنگلیوں میں بس گئی ہے - میں اپنی اُنگلیوں کو اپنی ناک تک بھی نہ لے جا سکا کہ کہیں دماغ - سڑ جاوے !!

سائیکل کے پہیے گھوم رہے تھے اور میں چلا جا رہا تھا - پیدل چلنے والے میرے پاس سے ہو کر پیچھے نکل جاتے تھے - دونوں طرف نئے نئے مکانات کھڑے ہوئے تھے یہ مکان کتنی خوبصورتی اور کتنی صفائی سے رکھے جاتے ہوں گے شاید ان کے کمروں کے اندر کوئی مکڑی کا جالا بھی نہ پایا جائے اور نہ کسی چڑیا کا گھونسلا !! مگر ان کے رہنے والوں کی

بابت مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں صرف مکان کی صاف اور رنگین دیواروں کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر کھڑکیوں میں رنگین اور موٹے پردے پڑے ہوئے تھے۔ پردوں کے پیچھے کیا ہے کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا۔ ایک آدمی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر گردن نکالے کھڑا تھا اور خود بخود سیٹی بجا رہا تھا۔ شاید سیٹی بجاتے وقت اسے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ سڑک پر سے کون گزر رہا ہے دوسرے دروازہ پر میں نے دیکھا کہ ایک فقیر چلا چلا کر بھیک مانگ رہا تھا مگر کوئی اس کی سن ہی نہیں رہا تھا۔

سڑک پر کوئی سایہ نہ تھا۔ دونوں کناروں پر صرف پتھر پڑے ہوئے تھے۔ سیدھی سڑک پہاڑی سے جا کر ملگئی تھی اور پھر پہاڑی کے دائیں طرف سے راستہ کاٹتی ہوئی ڈھال پر اُتر گئی تھی!! دونوں جانب پہاڑی کے پتھروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ اس پہاڑی پر بھی کوئی پیڑ نہ تھا، صرف پتھر ہی پتھر!! یہاں دن بھر جب پتھر دھوپ کی تپش سے آگ اُگلتے ہیں تو مزدور پتھروں کو توڑا کرتے ہیں اور انھیں بڑے بڑے پتھروں کے ڈھیر میں یہ مزدور رہتے تھے!!۔ ان کی جھونپڑیوں میں کوئی کھڑکی نہ تھی!!۔ چند اینٹوں کی کھردری سی دیوار اور اس کے اوپر پھوس کی چھت! اچھے خاصے گھونسلے معلوم ہوتے تھے!! حالانکہ وہ جھونپڑی نئے مکان کی طرح خوبصورت نہ معلوم ہوتی تھی مگر ان جھونپڑیوں میں زندگی معلوم ہو رہی تھی!! رنگین دیواروں کی آڑ میں رہنے والے لوگ سیٹی بجا بجا کر اپنی زندگی سے اتنے مطمئن ہو گئے تھے کہ زندگی بالکل ٹھہر گئی تھی مگر ان مزدوروں کی جھونپڑی میں زندگی کا بہاؤ معلوم ہو رہا تھا۔ مزدور اپنی زندگی سے کیسے مطمئن ہو سکتے تھے جب کہ ان کو اپنی زندگی کو قایم رکھنے کے لئے پہاڑی کے بھاری بھاری پتھروں کو توڑنا پڑتا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا کہ یہاں زندگی پتھروں کا چور اکرتی ہوئی تیز رفتار ندی کی طرح آگے بڑھ رہی ہے!!

ان گھونسلوں میں زندگی کی یہ طغیانی دیکھ کر مجھے چڑیوں کا گھونسلا پھر یاد آیا۔ چڑیوں کا گھونسلا بھی پھوس کا تنکوں کا اور چند دھاگوں سے بنا ہوا تھا، تو کیا ان تنکوں میں رہنے والوں کے اندر بھی زندگی اسی طغیانی سے بہ رہی تھی!! میں سوچنے لگا ـــــ اور خیال آیا کہ میں اکثر کرسی پر بیٹھا ہوا چڑیوں کو جگہ جگہ سے تنکے چنتے ہوئے دیکھا کرتا۔ جس جگہ سے بھی ان کو کہیں گھونسلے کا سامان مل جاتا وہ اپنے چونچ میں دبا کر لے آتی تھیں۔ ایک بار ایک لمبا دھاگا چڑیا نے اپنی چونچ میں دبا لیا تھا اور اس کو اپنے گھونسلے میں رکھنے کے لئے لا ہی رہی تھی کہ دھاگا اس کے پیروں میں اُلجھ گیا اور وہ گر گئی۔ جیسے کہ کوئی مزدور اپنے سر پر پتھر لئے ہوئے جاتا ہو اور ٹھوکر کھا کر گر پڑے!!۔ میں نے محسوس کیا کہ میں نے ایک جھونپڑے کو تباہ کر دیا ہے۔ اس کی چھت کا پھوس نوچ نوچ کر پھینک دیا ہے اور تنکوں کو ایک ایک کر کے پھینک دیا ہے۔ ان کے اندر رہنے والوں کی چیخ پکار میرا پیچھا کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی ـــــ "قاتل قاتل!"

میں نے اپنی سائیکل بغیر بریک کے پہاڑی کے ڈھال پر چھوڑ رکھی تھی اور وہ پوری رفتار سے ہوا کو چیرتی ہوئی ڈھال پر پھسل رہی تھی۔ کیونکہ میں پکڑے جانے کے ڈر سے بے تحاشا بھاگ رہا تھا مگر جتنی تیز سائیکل کی رفتار ہوتی جاتی تھی اتنی ہی تیز آوازیں بھی میرا پیچھا کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں!!

میں گھبرا گیا۔ سائیکل سے فوراً اُتر پڑا۔ سامنے دیکھا تو اناتھ آشرم کے بچے گا گا کر دوسروں کو اپنی بے بسی کا راگ سنا رہے ہیں تاکہ ان کو متاثر کر کے ان کو بھیک مل جاوے!!

میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ ان کا گانا رونے پیٹنے سے کم نہ تھا۔ اُف اس دنیا میں کتنی بے بسی ہے۔ ان بچوں کا کوئی گھر نہیں۔ ان کو پتہ بھی نہ ہوگا کہ ان کا گھر ہے بھی یا نہیں !! — اور میں اپنے دل میں خیال کرنے لگا۔ اگر ان کا گھر ہوتا ان کے ماں ہوتی، باپ ہوتے۔ ان کے بھائی بہن ہوتے۔ تو۔۔۔۔ ! میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے جمع ہو گئے تھے میں نے رومال سے انکو پونچھا۔ ایک درخت پر سے ایک چیل اُڑ کر آسمان میں تیرنے لگی۔ اس درخت میں کوئی پتا نہ تھا میں سوچنے لگا، جس طرح یہ چیل کسی پتے کا سایہ نہ پاکر درخت سے اُڑ گئی ہے اسی طرح وہ چڑیاں بھی گھونسلا نہ پاکر اُڑ گئی ہوں گی — میں نے واپس جانے کے لئے سائکل موڑی ہی تھی کہ ایک لڑکا ہاتھ پھیلائے میرے پاس کھڑا تھا میں نے اس کو پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس کو میں نے ہش کر کے ہٹا دیا تھا وہ لڑکا مجھے پہچان کر سہم گیا۔ میں نے پتلون کی جیب میں سے ایک پیسہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں !" میں نے پوچھا۔

وہ لڑکا پتھروں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے بولا "مر گئے"

"مر گئے ؟" — "ہاں" — "کیسے ؟" — "طوفان آیا۔ پانی آیا اور بہ گئے —

طوفان۔ آندھی۔ پانی !! بجلی کی رفتار سے یہ لفظ میرے دماغ میں ٹکرانے لگے۔

"تمہارا گھر کہاں ہے ؟" — "کہیں نہیں !!" — "سوتے کہاں ہو !!" — "درختوں کے نیچے"

اور میں اس تیزی سے سائیکل پر سوار ہوا کہ لڑکا دیکھتا رہ گیا۔ "انسان چاروں طرف تباہ ہو رہے ہیں !" میں سوچ رہا تھا۔ "ہم سب گھونسلوں میں رہتے ہیں۔ جیسے کہ ایک انسان کا ہاتھ گھونسلے کو نفرت اور بے دردی سے پھینک سکتا تھا اسی طرح قدرت بھی ہم کو ہمارے گھروں سے دور پھینک سکتی ہے"

میں نے ان سانپوں کی کہانی سنی تھی جو رات کو چڑیوں کے گھونسلے میں سے ان کے بچوں کو نگل جاتے ہیں۔ اور میں نے محسوس کیا کہ دنیا میں کتنے سانپ چاروں طرف لہرا رہے ہیں !۔ میں نے محسوس کیا۔ میرا ہاتھ سانپ ہے۔ میری ہتھیلی سانپ کے پھیلے ہوئے پھن کی طرح ہے اور میرا بازو سانپ کا لہراتا ہوا جسم !! ہر ایک انسان کا ہاتھ سانپ ہے ! سانپ نے انسان کو اپنے زہر سے اتنی تعداد میں ہلاک نہیں کیا ہوگا، جتنی تعداد میں انسان کے ہاتھوں نے انسانوں کو !! — مجھے ہر طرف سانپ ہی نظر آنے لگے۔ لہراتے ہوئے ڈستے ہوئے۔ انسانوں کو تباہ کرتے ہوئے۔ میرا دماغ چکرانے لگا تھا۔ میں سائیکل لئے ہوئے مکان کے اندر گھسا ہی تھا کہ میں چلا اُٹھا "سانپ !" کسم ڈر گئی اور بولی "کہاں ہے سانپ ؟" اس کی آواز نے میرے خیال کو برہم کر دیا۔ اور میں نے اپنی پیشانی سے پسینے کے ٹپکتے ہوئے قطرے پھر پونچھے !!

سائیکل کو رکھ کر میں سیدھا اپنے کمرہ میں پہونچا۔ دو ننھی چڑیاں اس روشندان میں بیٹھی ہوئی تھیں میں نے کھڑکی کھولکر دیکھا — ان کا گھونسلا اب بھی سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے گھونسلے کو اُٹھا کر اسی روشندان میں رکھ دیا۔ پھر وہی چیں چیں !!

شنکر سروپ بھٹناگر ایم - اے

مکتوباتِ نیاز

حضت ، آپ نے بھی کس زمانہ میں پہونچکر رسمِ شکوہ و شکایت قایم کی آپ میں "ادائے ترکانہ" ممکن ہے اب بھی باقی ہو، لیکن یہاں نہ عناصر میں اعتدال، نہ دماغ کو فرصتِ احساسِ جمال !

اختلال حواس کی ابتدا کا حال معلوم نہیں، لیکن اس کی انتہا سے ضرور آگاہ ہوں اور وہ یہ کہ

دیوانہ بہ خویش آشنا نیست

ظاہر ہے کہ اس صورت میں آپ کی "شکایت بیگانگی" کا شکریہ ادا کرنا بھی چاہوں تو ممکن نہیں — نہ آپ نے مجھے عرصہ سے دیکھا، نہ میں نے آپ کو۔ اس لئے ممکن ہو تو ایک دن کے لئے آجائیے، شاید "تجدیدِ محبت" سے مری ہوئی تمنائیں پھر جی اُٹھیں — اس کے بعد شکر و شکوہ کا بھی لطف ہے !

محترم — دل پُرسی اور ہمدردیوں کا شکریہ ! لیکن

باغم چہ تابِ دعوے و بر دل چہ اختیار!

زمانہ میرے لئے کبھی نامساعد ثابت نہیں ہوا، اور اب بھی نہیں ہے، لیکن ایک وقت آتا ہے، جب انسان خود زمانہ کے لئے نامساعد ہو جاتا ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس کا کوئی علاج نہیں — جب تک "برگ و ساز" کی فکر ہے، انسان زندہ ہے، لیکن اس فکر سے آزاد ہوتے ہی "گرانمایگی بے سر و پائی"، کا احساس شروع ہوتا ہے جو پُر لطف بھی ہے اور تکلیف دہ بھی — وہ اس لئے کہ ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا اور یہ اس لئے وہ کسی دوسرے کی مدد بھی نہیں کر سکتا۔

یہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان باتوں کے سمجھنے والے ہیں۔ کسی اور سے کہوں تو وہ مذاق سمجھے گا یا تصوف سو مذاق کی حد تک تو خیر کوئی حرج نہیں۔ لیکن تصوف کے الزام و اتہام کو کون اُٹھائے !

ہاں ، دہلی جانے کا قصد رکھتا ہوں، لیکن کب کا جواب میرے اختیار میں ہو تو آپ کو بھی چلنے کی دعوت دوں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ خود کوئی تاریخ مقرر کر کے تشریف لے آئیے، کیونکہ اس صورت میں معاملہ "ولے برندش" کا ہو جائے گا اور پھر اختیار و اختیار کی کوئی بحث ہی نہ رہے گی۔ ہاں ، تو بتائیے کب تک آئیے گا۔ مگر ڈرتا ہوں کہ مبادا اسکے جواب میں آپ بھی میری ہی طرح سپر ڈال دیں !

"بیوقوف ہوئے ہو، مجھے اتنی فرصت کہاں کہ ان کے پیچھے دنیا کی خاک چھانتا پھروں ——
"سیر گل می کنم از پرتو مہتاب کسے" —— اور خوش ہوں۔

ایک مہینہ ہوا جب ان کا خط ملا تھا، لیکن میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ تشریف لے گئیں۔ کہاں کا پتہ نہ اس سے پہلے کبھی چلا اور نہ اب اس کا امکان ہے۔ میری ان کی ملاقات بالکل "شہاب ثاقب" کی سی کیفیت رکھتی ہے یعنی بقول اکبر "وہ کیا ہیں اک جھلک ہیں، ہم کیا ہیں اک نظر ہیں" اور اگر کہیں آنکھ جھپک گئی تو یہ بھی ختم —— پھر وہی شبِ تار اور پھر وہی انتظار!

بہرحال اگر اس دوران میں کوئی اطلاع ملی تو آپ کو لکھ بھیجوں گا۔ مطمئن رہئے۔

مکرمی۔ میں بہت غور سے آپ کی تحریروں کا مطالعہ کر رہا ہوں اور آپ کے اس جہاد کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میرے آپ کے نقطۂ نظر میں تھوڑا سا اختلاف ہے، آپ نئی شاعری کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ پرانی نہیں ہے اور میں اس لئے کہ وہ نئی بھی نہیں ہے۔ نئے پرانے کا جھگڑا، مذہب و اخلاق وغیرہ کی بحث درمیان لانے سے طے نہیں ہو سکتا، بلکہ خالص افادی نقطۂ نظر سامنے رکھنے سے ہو سکتا ہے۔

جدید شاعروں کا کہنا یہی ہے کہ ان کی شاعری زمانہ کا اقتضاء ہے۔ اس لئے اگر وہ واقعی زمانہ کی کسی ضرورت کو پورا کرتی ہے تو اعتراض فضول ہے، لیکن اگر ایسا نہیں تو پھر قدیم و جدید کی بحث چھیڑنے کی کیا ضرورت۔

جس حد تک ٹکنک کا سوال ہے، میں ردیف و قافیہ کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتا، اگر اس پابندی کو ترک کرنے کے بعد واقعی کوئی کام کی چیز سامنے آتی ہے —— لیکن وزن و آہنگ کو بیشک ضروری جانتا ہوں، کیونکہ یہی ایک چیز ہے جو اسے نثر سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ایک چیز اور بھی ہے، جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ اُسلوب بیان ہے۔

اگر انداز بیان اُلجھا ہوا ہے تو شعر کی فنی و افادی دونوں حیثیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور اس نوع کی مرموز شاعری معمہ و چیستاں کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھتی —— عُریانی اور الحاد کے متعلق بھی میرا نظریہ آپ سے مختلف ہے میں ان دونوں باتوں کو بُرا نہیں سمجھتا اگر ذوق و وجدان مجروح نہیں ہوتے۔ لیکن یہ ہے بہت مشکل بات۔ کیونکہ شاعری، نفرت، انتقام، غصہ اور گندگی کو برداشت نہیں کر سکتی اور آجکل کی عُریاں اور الحاد کوش شاعری میں گندگی بھی ہے، اور جذبۂ نفرت و انتقام بھی۔

ترقی پسند شاعروں کی جماعت میں بعض ایسے بھی ہیں، جن میں شاعری کی بڑی زبردست صلاحیت پائی جاتی ہے، اس لئے بلا امتیاز سب کی مخالفت درست نہیں۔ آپ لکھئے جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں، میں نے آجتک کبھی ایسے مضمون کا جواب نہیں دیا، جو میری مخالفت میں لکھا گیا ہو۔ کیونکہ اس سے معاملہ طول پکڑ جاتا ہے اور نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔

باب الاستفسار

شیخ

(جناب محمد سعید صاحب۔ ریواڑی)

ہندوستان کے مسلمانوں میں شیخ، سید، مغل، پٹھان، چار قومیں بہت مشہور ہیں۔ سیدوں کا تعلق تو خیر کہا جاتا ہے کہ آل رسول سے ہیں اس لئے اُن کا سید یا سردار ہونا تو خیر ظاہر ہے، لیکن شیخ قوم کا تعلق حضرت ابوبکر صدیق سے بتایا جاتا ہے۔ اسکی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور کیا عربوں میں بھی کوئی قوم شیخ کہلاتی تھی۔ جس کی اولاد اپنے آپ کو شیخ کہتی ہے۔ اور کیا حضرت ابوبکر اسی قوم شیخ سے تھے۔

(نگار) عربی میں شیخ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عمر ۵۰ سال سے متجاوز ہوگئی ہو اور بڑھاپے کے آثار جس میں نمایاں ہوجائیں، چنانچہ رشتہ کے معمر آدمیوں اور قبیلہ کے بڑے بوڑھے کو شیخ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

قبل اسلام قبیلہ کا سردار سید کہلاتا تھا لیکن جب وہ معمر ہوجاتا تھا تو اُسے بھی شیخ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ بدوس عربوں پر شیوخ قبایل کا بڑا زبردست اخلاقی اثر ہوتا تھا اور ان کے یہاں وہی شخص شیخ کہلاتا تھا جو بہت آزمودہ کار ہو۔ ظہور اسلام کے بعد بھی اس کا مفہوم سردار ہی کا رہا، اور بعض ایسے افراد جو حکمرانی کا ولولہ رکھتے تھے وہ اپنے آپ کو شیخ ہی کہتے تھے۔ چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں ابو یزید نے شیخ المومنین کا لقب اختیار کیا اور ابن بطوطہ نے ایک گورنر کا ذکر کیا ہے جسکا لقب شیخ تھا مدینہ کے سردار کو بھی شیخ الحرم اسکی بزرگی کی وجہ سے کہتے ہیں اور ابن خلدون نے لکھا ہے کہ تیونسیا کے دربار حفصیہ میں وزیر اعظم اور ولی عہد دونوں کو شیخ کہتے تھے۔ اسوقت بھی کلام عرب میں شیخ ہر اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی قوم میں سیاسی، اخلاقی مذہبی یا علمی عزت و احترام رکھتا ہو۔ چنانچہ مفتی اعظم کو شیخ الاسلام، مذہبی اُمور کے وزیر کو شیخ الدین، اور وزیر بلدیہ کو شیخ البلد کہتا اسکی نسبت احترام کی وجہ سے ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق یقیناً اپنی وجاہت و اہلیت کی وجہ سے شیخ کہلاتے تھے، لیکن اس کا تعلق کسی قومیت سے نہیں ہے، عرب میں ہر ذی وجاہت انسان کو شیخ کہتے تھے۔ اب رہا ان کے اولاد کو اپنے آپ کو شیخ کہنا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ وہ اپنے آپ کو صدیقی کہہ سکتے ہیں، لیکن شیخ کہلانے کے لئے تو وہی خصوصیات ہونا چاہئے جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے ذات سے اس کا کیا تعلق جب کہ کسی زمانہ میں بھی وہاں ذات پات کی کوئی تقسیم نہ تھی۔

تاجیک

(جناب محمد اسلم صاحب۔ ہوشنگ آباد)

اس وقت تاجیک قوم کے لوگوں کا ذکر اکثر اخباروں میں آیا ہے اور جن میں سے ایک بڑا گروہ ترک وطن کر کے ہندوستان آگیا ہے اور حکومت نے ان کو مختلف مقامات میں آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ازراہ کرم مطلع فرمائیے کہ یہ کون قوم ہے اور اس کی کیا اصلیت ہے۔

(نگار) تاجیک اور تازیک ایک ہی چیز ہیں۔ آپ نے تازی کا لفظ بارہا سنا ہوگا، یہ بھی وہی چیز ہے، یہ لفظ، طے سے نکلا ہے، جو ایک مشہور عرب قبیلہ تھا۔ چونکہ یہ قبیلہ، ایران سے قریب تر تھا اس لئے ایرانی تمام عربوں کو اس قبیلہ سے منسوب کر کے تازیک کہنے لگے اور بعد کو ترکوں سے ممتاز کرنے کے لئے خود اہل ایران بھی اپنے آپ کو تازیک یا تازی کہنے لگے۔ چینی لفظ تاشی بھی یہی ہے۔

وسط ایشیا میں ایران کے لوگ، عرب کے تمام مسلم فاتحین کو اسی لفظ سے یاد کرتے تھے، جس طرح مسلمان ایرانی بعد کو عرب کہلائے جانے لگے۔ ترکوں میں اس لفظ کا مفہوم صرف مسلمان کا تھا، اس لئے وہ مسلمان ایرانیوں کو بھی تاجیک کہنے لگے اور اس طرح ان کی زبان میں تاجیک، تازیک یا تازی کے معنے ایرانی کے ہو گئے۔

چونکہ ترکوں اور ایرانیوں کے تعلقات ہمیشہ خراب رہے، اس لئے ترکوں نے ایرانیوں کو ہمیشہ تاجیک کہکر اپنے آپ کو اُن سے ممتاز کیا اور ایرانیوں نے بھی اپنے آپ کو اس امتیاز قایم رکھنے کے لئے تازی یا تاجیک کہلانا پسند کیا۔

چونکہ ایرانی لوگ تجارت کے سلسلہ میں اِدھر اُدھر زیادہ سفر کرتے تھے اور ترکوں سے بھی انھیں واسطہ پڑتا تھا، اس لئے ترکی میں انھیں سرت بھی کہنے لگے جس کے معنے تاجر کے ہیں، اس لئے بعد کو تاجیک اور سرت دونوں ہم معنے لفظ خیال کئے جانے لگے۔

اس وقت تاجیک قوم اُس آبادی کو کہتے ہیں جو مشرقی ایران کی رہنے والی ہے اور استر آباد اور بزد کے درمیان جو حصۂ زمین پایا جاتا ہے وہ اس آبادی کی انتہائی مغربی حد ہے۔ روس میں ترکستان کی تمام ایرانی آبادیوں کو تاجیک کہتے ہیں، جس کا نام انھوں نے تاجیکستان رکھا ہے۔ ان کی آبادی وہاں تقریباً ۹ لاکھ ہے۔ یہ زیادہ تر پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ ان کی زبان کہیں تو بالکل فارسی ہے اور کہیں مقامی زبانوں سے ملکر مختلف ہو گئی ہے۔

گزرجا

یہ منظر دلچسپ دمِ صبح، سرِ شام — افلاک کے زینے یہ ستاروں کے در و بام
یہ موجۂ انوار، جہاں سیر سبک گام — دل بھی ہے کشاکش میں نگاہیں بھی تہِ دام
ہر مرحلۂ شمع و شبستاں سے گزرجا

یہ گردشِ ایام یہ تنظیم مہ و سال — رفتارِ زمانہ کبھی ماضی ہے کبھی حال،
نیرنگیٔ عالم یہ بدلتے ہوئے احوال — ہر چیز پہ بس ایک اُچٹتی سی نظر ڈال
اور ہر روشِ عالمِ امکاں سے گزرجا

شاخوں پہ دمکتے ہوئے شبنم کے یہ گوہر — فردوس کے آثار ہیں ایک ایک روش پر
یہ سرو و گل و لالہ و نسریں و صنوبر — گلشن کی ہوائیں ہیں معطر ہی معطر
اس انجمنِ سنبل و ریحاں سے گزرجا

یہ شوخ پری چہرہ، گل اندام و خوش آواز — سرتا بقدم شوخی و رنگینی و انداز
نوخیز، جواں سال، نظرباز فسوں ساز — شوخی، کبھی غمزہ کبھی نخوت ہے کبھی ناز
جذبات کے اُٹھتے ہوئے طوفاں سے گزرجا

ساغر کی کھنک قُلقُلِ مینا کی صدائیں — برسات کی رُت، موسمِ گل، سرد ہوائیں
چھائی ہوئی افلاک پہ بدمست گھٹائیں — ساقی کی نوازش میں ادائیں ہی ادائیں
ٹھکرا کے مے و جامِ خمستاں سے گزرجا

یہ دشت و جبل، صحن چمن، وادی و صحرا — ساحل کی خموشی سے اُلجھتے ہوئے دریا
خشکی، کہیں پانی، کہیں اونچا کہیں نیچا — مغرب تری منزل ہے نہ مشرق تری دُنیا
یونان و سمرقند و بدخشاں سے گزرجا

یہ مدرسہ و خانقہ و کوچہ و بازار — کچھ اہلِ تجارت ہیں، بہت سے ہیں خریدار
تحریر گہر ریز ہے تقریر گہر بار — الفاظ کے دھوکے کہیں رنگینیٔ افکار
اس علم کے اس جہل کے عرفاں سے گزرجا

طوفاں کی طرف دیکھ نہ ساحل کی طرف دیکھ — لیلیٰ پہ نظر ڈال نہ محمل کی طرف دیکھ
ہُشیار سے رکھ کام نہ غافل کی طرف دیکھ — سب کچھ ہے ترے پاس ذرا دل کی طرف دیکھ
اور دل کے سوا ہر سر و ساماں سے گزرجا

ہے تیرا سفر سلسلۂ لامتناہی، — ہے تیری نگہباں تری خود دار نگاہی
دے اپنی خودی پر بھی کسی روز گواہی — تو اپنی جگہ آپ ہے تقدیر الٰہی
صوفی کے بتائے ہوئے ایماں سے گزرجا

اسرار القادری

موت

کیوں نہ جانے اس قدر اے دوست گھبراتا ہے تو
موت کا جب نام سنتا ہے، لرز جاتا ہے تو،
اُن کو کہنے دے، جو کہتے ہیں کہ دنیا کا نظام
خواب و بیداری کا اک آئین ہے وہ بھی ناتمام
زندگی ہے آب و گل کے ربط باہم کا مآل
موت ہے ہستی کے اجزائے مرتب کا زوال
شرح ترتیبِ عناصر ہے، نمود کائنات
کھیل ہے فطرت کا یہ ہنگامۂ مرگ و حیات
ابر برسا، پھول مہکے، اور معطر کر گئے،
ہے یہی آئینِ ہستی، مر گئے جو مر گئے

ان کو کہنے دے، کہ روحیں ان کی ہیں مصروفِ خواب
اور نظر پر ہیں خرد کی ناتمامی کے حجاب
پھول سے ٹکرا رہے ہیں خار اُبھرنے کے لئے
یہ بساطِ خاک پر زندہ ہیں مرنے کے لئے

(۲)

غور کر اے دوست! یہ خورشید و انجم اور یہ پھول
کیا یہ سب فطرت کے تعمیری حقایق ہیں فضول
منزلیں، راہوں کے پیچ و خم، یہ اوج اور یہ نشیب
تیری نظروں میں حقیقت ہیں کہ ہے یہ بھی فریب
ذرہ تا خورشید یہ پھیلے ہوئے ہستی کے جال
واقعہ ہیں یا مرتب ہے کوئی بزمِ خیال
یہ ازل سے نبضِ ہستی کا مسلسل اضطراب
کوئی بیداری کا منظر ہے کہ ہے انجام خواب

الغرض یہ کارگاہ زندگی، اتنی عظیم
موت کے طوفاں میں بہ سکتی نہیں میرے ندیم!
اور انساں زندگی کی صنعتوں کا شاہکار
چھو نہیں سکتی اسے موجِ فنا کی گیرودار
کوئی اس تعمیرِ محکم کو گرا سکتا نہیں
کوئی اس شمعِ تجلی کو بجھا سکتا نہیں

موت کیا ہے ایک نامحسوس دنیا کا پیام
عقلِ انسانی ابھی سمجھی نہیں جس کا نظام
جس طرح دن گردشِ دوراں سے بن جاتا ہے رات
پیرہن یونہی بدل دیتی ہے سیمائے حیات
اک نئی دُنیا اُسے ہوتا ہے آغوشِ نسیم
پھول کمھلاتا ہے لیکن مٹ نہیں جاتی شمیم
بحر میں گاہے سکوں ہے اور کبھی طوفاں کا زور
ایک ہی شے ہے کہیں شیریں کسی منزل میں شور
ایک موقع پر سبک رو، اک جگہ صبر آزما
ایک ہی رو ہے کبھی صرصر کہیں موجِ صبا
اس فضا میں ابتدا سے ہیں جو موجیں بے قرار
جنبشِ نبضِ ہوا، یا چشمکِ برق و شرار
زندگی کے جوش سے ناآشنا بھی ہو گئیں
کون کہہ سکتا ہے ان کو یہ فنا بھی ہو گئیں

علی اختر (حیدرآباد)

میرا ماحول

پیمبرا ہر من زادوں سے لرزاں ہیں جہاں میں ہوں
مہ و خورشید کی توہین ہوتی ہے اندھیروں سے
خباثت جھانکتی ہے کتنی شب بیدار آنکھوں سے
جو مادر زاد اندھے ہو کے بھی سورج پہ ہنستے ہیں
ہزاروں آشیاں برق و تلاطم کو ترستے ہیں
غرورِ جہل فکر و ہوش کی شمعیں جلاتا ہے
تکلف میں، تکلم میں، پیاموں میں، سلاموں میں
سیہ راتیں تھپک کر جن کو زانو پر سلاتی ہیں
یہیں آکر فرشتوں کے بھی بازو ٹوٹ جاتے ہیں
لباسوں میں بھی چھپ سکتی نہیں عریانیاں جن کی
وہ چہرے آہ جن پر کوڑھ کے دھبے نمایاں ہوں
یہاں خونیں شبابوں پر مے و نغمہ کی تہمت ہے
شبابوں کی گھٹا میں زرد رو مہتاب ہیں کتنے
بھڑکتی ہیں فضائیں جن کے آنچل کی ہواؤں سے
فرشتوں کے بھی شہپر سے مقدس جن کے دامن ہیں
مہ و خورشید جن کی پاکدامانی کے شاہد ہیں
کمندیں ڈالتے ہیں جن کے جلوے ماہ و انجم پر

وہاں لات و ہبل کعبے کے دُر میں جہاں میں ہوں
رسولوں پر وہاں بوجہل خنداں ہیں جہاں میں ہوں
مہ و خورشید کتنے ظلمتِ افشاں ہیں جہاں میں ہوں
بہت ایسے بھی فرزندانِ عرفاں ہیں جہاں میں ہوں
ہزاروں پھول توہینِ بہاراں ہیں جہاں میں ہوں
سفینوں کے جلو میں برق و طوفاں ہیں جہاں میں ہوں
شرافت کے ہزاروں زخم عریاں ہیں جہاں میں ہوں
وہ تارے آفتابوں کے نگہباں ہیں جہاں میں ہوں
دو عالم اپنے مرکز سے گریزاں ہیں جہاں میں ہوں
غلام ایسے ہزاروں میر و سلطاں ہیں جہاں میں ہوں
انہی چہروں سے آئینے پشیماں ہیں جہاں میں ہوں
ہزاروں مطرب و ساقی پریشاں ہیں جہاں میں ہوں
غزالانِ حرم بھی پابجولاں ہیں جہاں میں ہوں
وہ لالہ رخ وہاں محبوس زنداں ہیں جہاں میں ہوں
وہ مریم زادیاں سر در گریباں ہیں جہاں میں ہوں
وہ حوریں بھی وہاں دوزخ بداماں ہیں جہاں میں ہوں
وہ آہو بھی اسیرِ دامِ دوراں ہیں جہاں میں ہوں

مری جنت اسی ظلمت کدے کی خاک برہم ہے
مرا ماحول ہی اے ہم نشیں میرا جہنم ہے

پروفیسر شور

اپنی نوعیت کا واحد ترقی پسند رسالہ
ماہنامہ "منزل" لکھنؤ
بلند پایہ تنقیدی مضامین، کیف آور نظموں اور غزلوں اور معیاری افسانوں کا حسین اور دلکش مجموعہ۔
سالانہ چندہ چار روپے۔ طلبہ سے تین روپے۔ نمونہ کا پرچہ چھ آنے کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیے۔
مینجر ماہنامہ "منزل" فرنگی محل لکھنؤ

غزل : حسرت ترمذی

فلک ہمارا فلک نہیں ہے، زمیں ہماری زمیں نہیں ہے
قریب منزل کے کھا رہے ہیں، ہماری منزل کہیں نہیں ہے

خیال سود و زیاں سے اب تک بلند ہے جذبۂ محبت
اُسے تمنائے عیش کیا ہو، جو غم سے اندوہ گیں نہیں ہے

ہر ایک لحظہ، ہر ایک ساعت، ہیں جس کو بھولا نہیں ہوں اب تک
اُسے نہ ہو کچھ خیال میرا، مجھے تو اُس کا یقیں نہیں ہے

خیال ہی ہو کے رہ گیا ہے وہ عہد رنگینیٔ محبت
وہ دامن گل فشاں نہیں ہے، وہ کاکل عنبریں نہیں ہے

شراب اُلفت کا ذکر کیا ہے، شراب ہی وہ نہیں ہے حسرت
رگوں میں روحِ حیات بنکر جو شعلۂ آتشیں نہیں ہے

غزل : مہر اکبر آبادی

جفائے یار کا بھی آسرا نہیں باقی،
فریبِ لطف و وفا پھر بھی کھا رہا ہے کوئی

دلائے یاد کوئی جیسے بھولی باتوں کو
نظر سے آج نظر یوں ملا رہا ہے کوئی

سکوتِ ہجر میں یوں دل ہے گوش بر آواز
کہ جیسے مجھ کو فسانے سنا رہا ہے کوئی

ستم کے پردے میں ہے طرزِ دلنوازی بھی
بچا بچا کے نگاہیں ملا رہا ہے کوئی

یہیں سے لطف و کرم کی ہو ابتدا شاید
وہ بے بسی پہ مری مسکرا رہا ہے کوئی

غزل : نیساں اکبر آبادی

سُن رہا ہوں وہ جانِ انتظار آجائے گا
صبر تھوڑا چاہئے، اے دل قرار آجائے گا

وہ جو آئے اور بھی بیتابیاں کچھ بڑھ گئیں
میں یہ سمجھا تھا کہ اب مجھ کو قرار آجائے گا

زیست کی بیچینیاں بیکار جانے کی نہیں
زندگی جب لے گی کروٹ پھر قرار آجائے گا

موسمِ فصلِ بہاراں ہو نہ ہو نیساں مگر
وہ اگر آجائیں گے۔ دورِ بہار آجائے گا

"نگار" جنوری ۴۵ء

کے متعلق ہماری ایک خاص لیکن ایک بالکل نئی اسکیم آیندہ اشاعت میں نگاہ سے گزرے گی۔ امید ہے کہ آپ اس پر غور فرمائیں گے اور ہمیں اپنی رائے سے مطلع کریں گے۔

مینجر نگار

مطبوعات موصولہ

مطبوعات انجمن ترقی اُردو، دہلی

کیفیہ یہ تصنیف ہے جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی، جس میں اُردو زبان کی تاریخ اور اس کے املا و انشاء وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب اٹھارہ ابواب میں منقسم ہے۔ سب سے پہلے اُردو زبان پر تاریخی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں جتنے مباحث سامنے آسکتے ہیں، ان سب پر نہایت جامعیت سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تاریخ کے بعد حروف تہجی، الفاظ، اور اُن کے مرکبات سے گفتگو کی گئی ہے اور پھر متعدد ابواب میں قواعد اُردو کی تمام خصوصیات کو پیش کر کے محاورات، اُسلوب بیان، عروض و قافیہ اور مطایبات و مراسلات وغیرہ بہت سے مسایل میں داد تحقیق دی گئی ہے۔

یہ کتاب جناب کیفی کے سالہا سال تحقیق کا نتیجہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہت سی بیش بہا معلومات پر مشتمل ہے ضخامت ۳۸۰ صفحات۔ کاغذ دبیز ہے طباعت و کتابت بہت صاف۔ قیمت مجلد چار روپیہ اور غیر مجلد تین روپیہ۔

چند ہمعصر مجموعہ ہے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کے بعض اُن مضامین کا جن میں انھوں نے اپنے بعض ہمعصر حضرات کے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

اس مجموعہ میں سترہ حضرات کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں امیر مینائی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، مولانا وحیدالدین سلیم، محسن الملک مولانا محمد علی، مولانا حالی وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ہر چند ان مضامین کا تعلق سیرت نگاری سے نہیں، لیکن پھر بھی بہت سی باتیں ان میں ہم کو ایسی نظر آتی ہیں، جو شاید دوسری جگہ نظر نہ آئیں۔ اس کتاب کو مرحوم شیخ چاند ام۔ اے نے مرتب کیا ہے۔

ضخامت ۱۸۸ صفحات، کاغذ دبیز، کتابت و طباعت بہت صاف۔ قیمت مجلد عہ، غیر مجلد عہ

ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ تصنیف ہے ڈاکٹر سید عبداللہ ام۔ اے کی جو اورینٹل کالج لاہور میں لکچرر کی حیثیت سے مامور ہیں۔ یہ کتاب دراصل اُن کے اس مقالہ کا اُردو ترجمہ ہے جس پر انھیں ڈی لٹ کی ڈگری ملی تھی۔

موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے، ڈاکٹر صاحب نے انتہائی محنت و کاوش سے کام لیکر تمام مواد فراہم کیا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ اسے پیش کیا ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ عہد مغلیہ سے قبل ہندوؤں میں فارسی ذوق کا کیا رنگ تھا اور دوسرے باب میں عہد اکبری کے فارسی داں ہندوؤں کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے، تیسرے باب میں جہانگیر سے فرخ سیر تک، چوتھے میں مغلوں کے زمانۂ انحطاط تک، پانچویں میں سنہ ۱۲۲۹ھ سے عہد حاضر تک تمام ہندو اہل قلم کے حالات اور ان کے کارناموں سے بحث کی گئی ہے۔

چھٹا باب جس کو تمام گزشتہ ابواب کا تلخیص و تبصرہ کہنا چاہئے، بہت زیادہ اہم و دلچسپ ہے۔

تصویروں اور تحریروں کے عکس سے اس کتاب کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اردو میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے جو اتنی جامعیت سے لکھی گئی ہے اور ملک کو فاضل مصنف اور انجمن ترقی اردو کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کی وساطت سے یہ بیش بہا ذخیرۂ معلومات کا پبلک میں آسکا۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات کاغذ دبیز، طباعت و کتابت بہت صاف۔ قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد سے۔

دیوان بہرام

بہرام جی جاماسپ جی دستور کے اردو کلام کا مجموعہ جسے مسلم ضیائی ام۔اے نے مرتب کیا ہے دستور بہرام نوساری کے مشہور پارسی خاندان کے فرد تھے جو ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۹ء تک زندہ رہے۔ ان کو شعر و ادب سے بڑی دلچسپی تھی اور فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ناسخ و آتش کے قوال ان کی اکثر غزلیں گایا کرتے تھے۔

یہ دیوان کئی قلمی نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور صاحب دیوان کے حالات مقدمہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دئے گئے ہیں۔ کلام کا رنگ وہی ہے جو اُس زمانہ میں عام طور پر رائج تھا۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات، کاغذ دبیز طباعت و کتابت پسندیدہ۔ قیمت مجلد ۴ عہ۔ غیر مجلد ۳ عہ۔

فردوسی پر چار مقالے

پروفیسر حافظ محمود شیرانی، فارسی شاعری کی ریسرچ کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں، اور فردوسی تو خصوصیت سے ان کا موضوع تحقیق رہا ہے۔

اس کتاب میں فردوسی پر ان کے چار مقالے شامل ہیں، پہلے مقالہ میں شاہنامہ کی تصنیف اسباب سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں ہجو سلطان محمود غزنوی کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ تیسرے میں فردوسی کے مذہب پر اور چوتھے میں فردوسی کی مثنوی یوسف زلیخا پر گفتگو کی گئی ہے۔

یہ چاروں مقالے اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت مکمل اور بیش بہا معلومات کے حامل ہیں اور بہت سی اُن غلطیوں کو دور کرتے ہیں جو فردوسی اور اس کی شاعری کے متعلق لوگوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ فارسی کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی و افادہ سے خالی نہیں۔

حجم ۲۷۲ صفحات۔ کاغذ دبیز۔ طباعت و کتابت روشن۔ قیمت مجلد ۳ عہ، غیر مجلد ۲ عہ

تنقید شعر العجم

یہ کتاب پروفیسر محمود شیرانی کا بڑا زبردست انتقادی کارنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم سے ان کی کتاب شعر العجم میں کیا کیا غلطیاں ہوئی ہیں۔

جس زمانہ میں یہ انتقادی مقالہ بالاقساط رسالہ اُردو میں شایع ہوا تھا، اسی وقت اس کی شہرت عام ہو گئی

تھی اس لئے ضرورت تھی کہ اس کو کتابی شکل میں شایع کیا جاتا ہے۔

اس میں ایک ضمیمہ رباعی کے متعلق بھی شامل کر دیا گیا ہے، جو جواب ہے سید سلیمان ندوی کے اُن اعتراضات کا جو انھوں نے پروفیسر شیرانی کی تحقیق رباعی پر وارد کئے تھے۔

یہ کتاب انتقاد عالیہ کا بہترین نمونہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اُردو میں اس نوع کے نقد و تبصرہ کی یہ بالکل پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر شیرانی کا دائرۂ تحقیق کتنا وسیع ہے اور ان کا مطالعہ کس قدر گہرا ہے۔ حجم ۱۱۰ صفحات۔ قیمت مجلد چھ روپیہ، بلا جلد پانچ روپیہ۔

کتاب الہند البیرونی کی کتاب الہند، دنیا کی نہایت مشہور کتابوں میں سے ہے۔ مسلمانوں میں، البیرونی پہلا شخص تھا جس نے ہندوؤں کے علم و تمدن کا براہ راست مطالعہ کر کے تمام اہم معلومات فراہم کیں۔ یہ کتاب اسی کی دوسری جلد ہے جس کا ترجمہ سید اصغر علی صاحب نے کیا ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد سے،

مکالمات افلاطون افلاطون کی شخصیت سے تو ہر شخص واقف ہے لیکن اس کے کارناموں کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ اس کی تصانیف یورپ کی تمام زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں، لیکن اُردو میں اب تک اس کی صرف ایک کتاب کا ترجمہ ریاست کے نام سے شایع ہوا تھا۔

اب انجمن ترقی اُردو نے اس کے آٹھ مکالمات کا ترجمہ اور شایع کیا ہے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی محنت کا نتیجہ ہے۔ حجم ۴۷۶ صفحات۔ قیمت مجلد صہ، غیر مجلد للعہ،

مشاہیر روما و یونان جلد اول حکیم پلوتارک یونانی کی کتاب السیر کا ترجمہ ہے جناب ہاشمی فرید آبادی کے قلم سے۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۱۶ء میں شایع ہوئی تھی اب مزید اصلاح و ترمیم کے بعد دوبارہ شایع کر گئی ہے۔ کتاب کی خوبی کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، کیونکہ پلوتارک کی یہ وہ کتاب ہے جو ادب و انشا اور تاریخی حیثیت سے خاص مرتبہ کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ رہا ترجمہ، سو وہ بھی ایک مشاق شخص کا کیا ہوا ہے، اور اس لئے اس کو اچھا ہونا ہی چاہئے۔

ضخامت ۴۴۸ صفحات۔ قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد ہے

نظریۂ تعلیم حصۂ دوم ڈاکٹر جارج کرشین اسٹائنر، جرمنی کا مشہور ماہر تعلیم ہے اور اس نے نظریۂ تعلیم کا بڑا غایر مطالعہ کیا تھا یہ کتاب اس موضوع پر اس کی مشہور تصنیف کا ترجمہ ہے، جسے ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب نے نہایت صاف و پاکیزہ زبان میں پیش کیا ہے۔ مسئلہ تعلیم و تعلم سے دلچسپی لینے والوں کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ حجم ۳۵۲ صفحات، قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد سے،

ہمارے بینک محمد احمد سبزواری ام۔ اے کی تصنیف ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ بینک اور اس کا کاروبار کیا معنی رکھتا ہے اور پبلک اس سے کیا فوائد حاصل کر سکتی ہے۔

اس وقت جبکہ صنعت و تجارت کی ترقی کی نئی راہیں دنیا کے سامنے آ رہی ہیں بینک سسٹم کا مطالعہ بہت ضروری ہے، کیونکہ تجارت و کاروبار کا تعلق بالکل بینکوں سے ہے اور بغیر انکی وساطت سے ہم کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔

ضخامت ۱۵۸ صفحات - قیمت مجلد ۱۲/ عا، غیر مجلد ۱۱/ عہ -

الف لیلہ ولیلہ الف لیلہ کا ترجمہ اس سے پہلے بھی ہوچکا ہے اور شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے ابتداً عمر میں اس کا مطالعہ نہ کیا ہو لیکن ترجمہ ہونے کی حیثیت سے اس پر نظر ثانی کی ضرورت تھی - چنانچہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد نے براہ راست عربی زبان سے پھر اس کا ترجمہ کیا جو نسبتاً پہلے ترجموں سے بہتر ہے - حجم ۵۵۴ صفحات - قیمت مجلد صہ/، غیر مجلد للعہ -

مانڈو ریاست دھار میں مانڈو کے کھنڈر، بڑی تاریخی چیز ہیں اور سیاح اکثر وہاں جاکر ان آثار کا مطالعہ کرتے ہیں مانڈو کی تاریخ غور سے بھی بہت پہلے شروع ہوتی ہے اور یہ وہی مقام ہے جہاں باز بہادر اور روپ متی کا مشہور افسانۂ عشق و محبت تکمیل کو پہونچا -

جناب غلام یزدانی صاحب ناظم محکمۂ آثار قدیمہ حیدرآباد نے ریاست دھار کی دعوت پر ان آثار پر ایک تحقیقی مقالہ انگریزی میں شایع کیا تھا اور یہ اس کا ترجمہ ہے - جناب میرزا محمد بشیر کے قلم سے - کتاب بہت دلچسپ ہے - ضخامت ۱۳۲ صفحات قیمت مجلد ۷ے، غیر مجلد عا -

دوسرے اداروں کی مطبوعات

ہماری گلی پروفیسر احمد علی جدید ادبی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں، جس کی ابتدا "شعلے" کی اشاعت سے ہوئی - اس کتاب کی ضبطی کے بعد انھوں نے انگریزی میں ایک ناول لکھا جو یوروپ میں بھی بہت مقبول ہوا، اور اس کی مقبولیت کا راز اس کے بیان کا اچھوتا پن تھا -

اب اُردو میں پھر ان کے سات افسانے ہماری گلی کے عنوان سے شایع ہوئے ہیں - ان افسانوں کا انداز بیان یقیناً عام فسانوں سے بہت الگ ہے اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب کی نگاہ کس طرح جزئیات تک پہونچتی ہے اور پھر ان کا قلم ان نازک تاثرات کو کس خوبی سے پیش کرتا ہے -

قیمت ۱۲/ عہ - ملنے کا پتہ انشا پریس - ۱۹ کوچہ

سوویٹ روس موجودہ جنگ نے روس کو ہمارے ذہن و خیال سے بہت قریب کردیا ہے اور عام طور سے وہاں کے حالات سے بہت دلچسپی لیجاتی ہے، چنانچہ اس دوران میں بہت سے مضامین سوویٹ حکومت کے متعلق شایع ہوچکے ہیں -

ضرورت تھی کہ اُردو میں کوئی ایسی کتاب بھی شایع کی جائے جو سوویٹ روس کے تمام پہلوؤں پر عام فہم انداز میں روشنی ڈال سکے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جناب محمد کلیم اللہ صاحب کی یہ کتاب اس کمی کو بدرجۂ اتم کے پورا کرتی ہے - حجم ۲۰۳ صفحات - قیمت مجلد کاپی تین روپیہ - ملنے کا پتہ: ماڈرن بک ڈپو - سلطان بازار - حیدرآباد دکن -

یہ دلی ہے تصنیف ہے جناب سید یوسف بخاری کی - اس میں انھوں نے پرانی دلی اور وہاں کی زندگی کو

دلّی ہی کی زبان میں پیش کیا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔

بعض مقالے اس کے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں اور بعض بالکل نئے ہیں۔ اب کہ قدیم تہذیب و معاشرت ہر جگہ سے مٹتی جا رہی ہے — ایسی کتابیں بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں اور ان کا مطالعہ فسانوں سے زیادہ لطف دیتا ہے قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ مکتبۂ جہاں نما، دہلی۔

تلخ و شیریں مجموعہ ہے جناب صلاح الدین قریشی کے ۱۷ افسانوں کا جو عربی، انگریزی اور فرانسیسی سے لئے گئے ہیں، اور اس سے قبل مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ ترجمہ بہت شگفتہ ہے اور کتابت و طباعت نہایت پسندیدہ۔ قیمت دو روپیہ، حجم ۲۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ جہاں نما دہلی۔

گردش جناب مجنوں گورکھپوری کا طویل افسانہ ہے، جو ہارڈی کے ایک تمثیلی ناول کے طرز پر لکھا گیا ہے؛ مجنوں صاحب ہارڈی سے بہت متاثر ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس کے رنگ کو اردو میں خوب نباہتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ کتب خانۂ علم و ادب دہلی۔

اُمّت کی مائیں علامہ راشد الخیری مرحوم کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے رسول اللہ کے ازواجِ مطہرات کے حالات قلمبند کئے ہیں — ظاہر ہے کہ اس موضوع پر علامۂ مرحوم سے بہتر اور کون لکھ سکتا ہے یہ چوتھا اڈیشن ہے دو روپیہ میں نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی سے مل سکتا ہے۔

ہندوستان ہمارا اس مختصر مقالہ میں سری رام شرما ام۔ اے نے بتایا ہے کہ ہندوستان، دوسرے ممالک کے مقابلہ میں کن خصوصیات کا حامل ہے۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی پبلشرز دہلی۔

۴۳ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں ادارۂ چمنستان دہلی اس سے پہلے ۴۲ء کی معیاری غزلیں شایع کر چکا تھا، اب اس نے ۴۳ء کے متعلق پھر ایسی ہی کتاب شایع کی ہے، جس میں ۱۴ غزلیں اور ۱۰ نظمیں ہیں، فہرست کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے بہترین شاعروں میں سے کسی کو نہیں چھوڑا گیا ہے اور ہر ایک کا نمونۂ کلام اس میں درج ہے۔

قیمت ایک روپیہ — ملنے کا پتہ: ہندوستانی پبلشرز۔ دہلی

حسرت موہانی جناب عبدالشکور ام۔ اے کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے مولانا حسرت موہانی کے حالات زندگی اور انکی شاعری پر اپنے خیالات کو قلمبند کیا ہے۔ کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

قیمت دو روپیہ — ملنے کا پتہ: شاہ اینڈ کمپنی آگرہ۔

طوبیٰ مجموعہ ہے جناب شفیق جونپوری کی غزلوں اور نظموں کا۔ شفیق صاحب یوپی کے نہایت خوشگو و مشاق شاعر ہیں۔ صفائی و شگفتگی کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری ان کا ذوق ہے، جسے وہ بہت تکمیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہر چند یہ قدیم اسکول کے غزل گو شاعر ہیں، لیکن انکے کلام میں ہم کو جدید اسکول کی وہ تمام باتیں بھی ملتی ہیں، جنکا تعلق جدت و نوائے تعبیر سے ہے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ سکریٹری نظام ادب جونپور

کارل مارکس ترجمہ ہے ل۔ پرچک کے رسالہ کا جسے شرف عالم صاحب نے اردو میں پیش کیا ہے۔ کارل مارکس سے آج

کون واقف نہیں، لیکن اس کی صحیح تعلیمات سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں، ضرورت ہے کہ اس موضوع پر متعدد کتابیں شایع ہوں اور لوگ انکا مطالعہ کریں۔

یہ رسالہ ہر چند کارل مارکس پر کوئی بسیط کتاب نہیں ہے، تاہم باوجود اختصار کے بڑی حد تک جامع ہے۔ ترجمہ اچھا کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت بمبئی۔

جہاں آرا شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا کی رومانی زندگی کے بعض واقعات مشہور ہیں، گو انھیں تاریخی اہمیت حاصل نہیں۔ ظفر قریشی نے انھیں واقعات کو ناول کی صورت میں پیش کیا ہے اور مقدمہ میں اسکا اظہار کر دیا ہے کہ ان کو تاریخی اہمیت نہ دیجائے۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی

جھنکار مجموعہ ہے جناب کیفی اعظمی کی نظموں کا۔ کیفی جدید رنگ کے ترقی پسند شاعر ہیں، لیکن کم مشہور اور کم بدنام۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ان کے ماحول کی پیداوار ہے، زمانہ کے اقتضاء کی چیز ہے اور اس لئے اس میں بڑی جان ہے۔

ابتدا میں سجاد ظہیر صاحب کا تعارفی مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ قومی دارالاشاعت بمبئی (۴)

زنداں مجموعہ ہے جناب یوسف ظفر کی نظموں کا، جو نہایت اہتمام کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ نظمیں تمام تر معرا ہیں، ردیف و قافیہ سے، مگر معنی سے نہیں۔ یوسف ظفر ترقی پسند شعراء میں ایک خاص مرتبہ و منزلت رکھتے ہیں، یعنی یہ کہ ذہن انسانی کو وہ بہت کم ضغطہ میں ڈالتے ہیں اور ندرت کا مفہوم اُن کے یہاں محض معمہ و چیستاں نہیں۔ حسن تعبیر اور انداز بیان کے لحاظ سے ہمیں ان کی نظموں میں بعض بڑی پیاری چیزیں نظر آتی ہیں، اور اگر کہیں کہیں وہ ذہنی دست رس سے دور نہ ہو جائیں تو کلیجہ سے لگا لینے کے قابل ہیں۔

قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ: اُردو بک اسٹال۔ لاہور

نگارستان مجموعہ ہے مولانا ظفر علی خاں کی تقریباً ۲۰۰ نظموں کا جو مذہب، اخلاق، سیاست، ہجو، طنز اور انتقاد سبھی کچھ اپنے اندر رکھتی ہیں۔

مولانا اپنی شاعری کے بعض خصوصیات کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں اور اس میں شک نہیں کہ مشکل قافیوں کے صرف کرنے اور جلد سے جلد نظم طیار کر دینے کا انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔

کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔ قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ: پبلشرز یونائٹڈ۔ انارکلی۔ لاہور

ابن خلدون کی عظمت جناب نکہت شاہجہاں پوری کی مختصر سی تصنیف ہے، جس میں انھوں نے اسلام کے مورخ اعظم ابن خلدون کی حقیقی اہمیت و عظمت کو ظاہر کیا ہے۔ ابن خلدون سے پہلے تاریخ ایک ایسی اُلجھی ہوئی چیز تھی جسے قصہ و حکایت سے زیادہ کچھ نہ کہا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ پہلا شخص تھا جس نے بتایا کہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کیا چیز ہے۔ یہاں تک کہ آج یوروپ کا بڑے سے بڑا مستشرق اس کے کارناموں کے آگے سر جھکاتا ہے، نکہت صاحب کا یہ رسالہ گو محض ایک مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن مطالب کے لحاظ سے بہت وسیع مقاصد پر حاوی ہے۔ قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ: علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی ۳۷۳ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی (۳)

آپ اپنے لڑکے کو کس حال میں دیکھنا چاہتے ہیں؟

ایک بے ہنر آدمی ملازم جو سخت مشقت کے باوجود مفلس و نادار رہے یا ایک ماہر فن کاریگر جو اطمینان و آسودگی کی زندگی بسر کر سکے۔ اگر آپ کا لڑکا میٹرک یا مڈل تک یا فقط پانچویں ہی جماعت تک پڑھا ہوا ہے تو وہ سرکاری ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر میں داخل ہو سکتا ہے۔ وہاں وہ مفت ہنر سیکھے گا اور آج ہی سے روپیہ کمانے لگے گا۔ ٹریننگ کے بعد اسے فوجی محکموں سامان جنگ (آرڈننس) کے کارخانوں یا صنعتی کارخانوں میں بطور کاریگر ملازمت دی جائے گی۔ فنی مہارت جنگ کے بعد بھی اس کے کام آئے گی اور وہ آئندہ کے صنعتی ہندوستان میں معقول روزگار حاصل کر سکے گا۔

اپنے لڑکے کو صنعتی تربیت مفت دلوایئے

اس پراسپکٹس کیلئے فوراً لکھئے.....
جس سے معلوم ہوگا کہ کس طرح آپ کے لڑکے کی زندگی ہو سکتی ہے۔

حکومت ہند
ڈائرکٹر ٹیکنیکل ٹریننگ محکمہ لیبر

چیرمین یونائیٹڈ نیشنل سروس لیبر بیورو نمبر ۲ کے ۱/۲ نواب گنج روڈ۔ کانپور
چیرمین دہلی و اجمیر مارواڑ نیشنل سروس لیبر بیورو ۴۔ خانگ سان روڈ دہلی
چیرمین پنجاب و صوبہ سرحد لیبر بیورو ۔۴۔ مزنگ روڈ ۔ لاہور